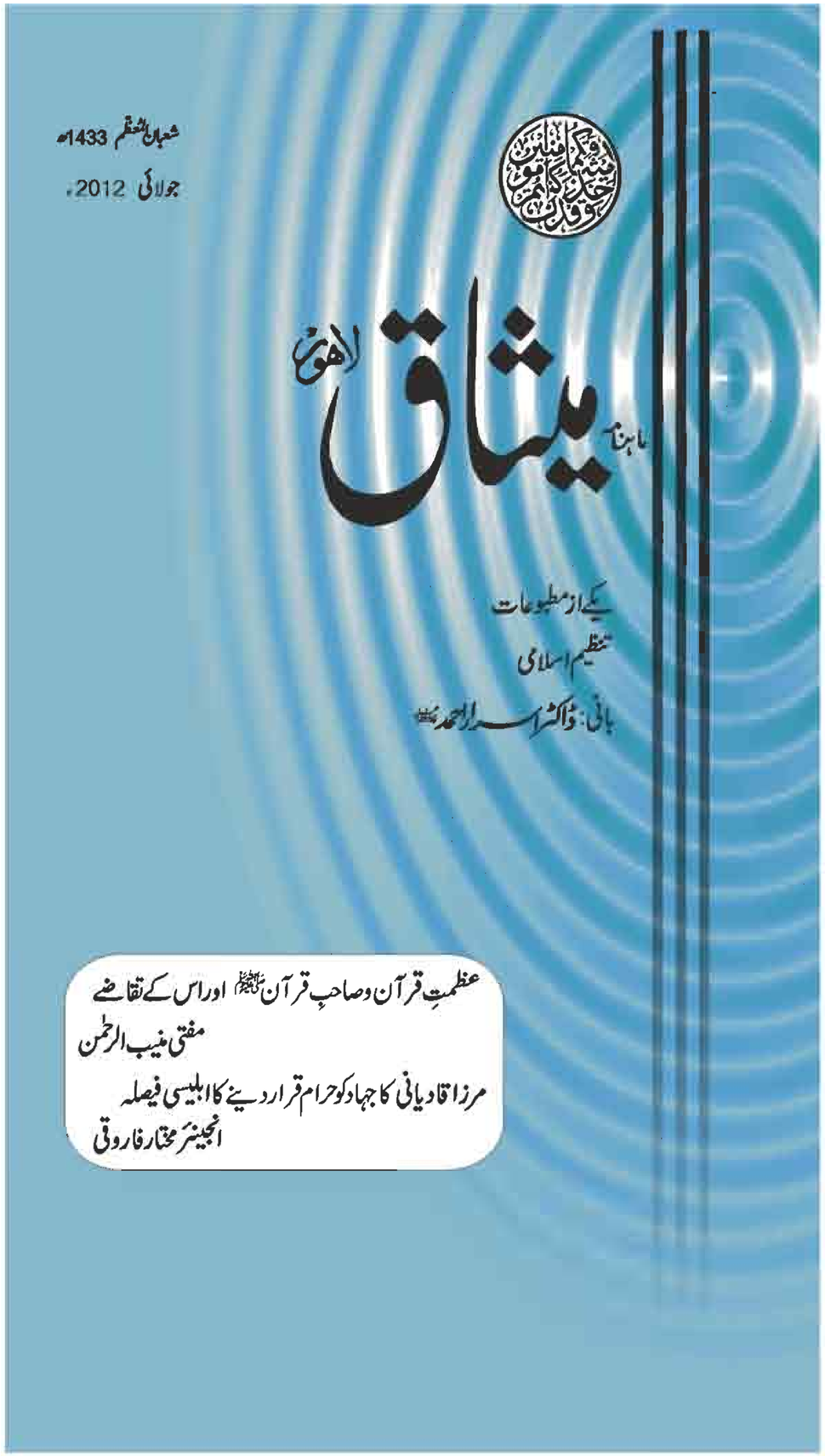

شعبان المعظم 1433ھ

جولائی 2012ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عظمتِ قرآن وصاحبِ قرآن ﷺ اور اس کے تقاضے

مفتی منیب الرحمٰن

مرزا قادیانی کا جہاد کو حرام قرار دینے کا ابلیسی فیصلہ

انجینئر مختار فاروقی

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن

پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول: سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

صفحات: 360، قیمت 450 روپے

حصہ دوم: سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

صفحات 321، قیمت 400 روپے

حصہ سوم: سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ

صفحات 331، قیمت 400 روپے

عمدہ طباعت ✱ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ✱ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ
میثاق
لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

جلد :	61
شمارہ :	7
شعبان المعظم	1433ھ
جولائی	2012ء
فی شمارہ	-/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرونِ ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ____ 3
خس کم' ہنوز جہاں ناپاک
ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ____ 5
سورۃ التوبۃ (آیات ۳۰ تا ۶۰)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ ____ 31
مرزا قادیانی کا جہاد کو حرام قرار دینے کا ابلیسی فیصلہ
انجینئر مختار فاروقی

دعوتِ فکر و عمل ____ 39
عظمتِ قرآن و صاحبِ قرآنؐ
اور دورِ حاضر میں اس کے تقاضے
پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

تعمیرِ سیرت ____ 51
صدق و سچائی: اخلاقی خوبیوں کی اصل بنیاد
عتیق الرحمٰن صدیقی

حقیقتِ دین ____ 60
دین اسلام کے تین مراتب
حافظ محمد مشتاق ربانی

اُمّہات المؤمنینؓ ____ 65
اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا
حافظ محمد زاہد

تحریکِ تجدّد و متجدّدین ____ 77
مولانا وحید الدین خان: اپنے الفاظ کے آئینے میں (۵)
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خس کم، ہنوز جہاں ناپاک!

فارسی کا ایک محاورہ ہے ''خس کم جہاں پاک'' لیکن اس تحریر کا عنوان باندھتے ہوئے ہم نے جس طرح اسے بگاڑا ہے یعنی ''خس کم ہنوز جہاں ناپاک'' اس پر فارسی اور اچھی اردو سے شغف رکھنے والے حضرات سے ہم معذرت خواہ ہیں۔ لیکن نیم خواندہ قسم کے لوگوں کی طرف سے ہم پر یہ اعتراض وارد ہوتا رہتا ہے کہ ہم بعض اوقات ملی جلی اردو فارسی لکھتے ہیں جس سے ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ ہم چونکہ خود بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں' لہٰذا ان کا اطمینان بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ ''خس'' کے لغوی معنی ہیں سوکھی ہوئی گھاس جسے گھاس پھوس بھی کہا جاتا ہے۔ جب کوئی باغبان زمین کو اس سے پاک کر دیتا ہے تو وہ روئیدگی کے حوالہ سے پاک ہو جاتی ہے۔ فارسی کا یہ محاورہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی نالائق یا نکما شخص جو خیر کی بجائے شر کا باعث بن رہا ہو' کہیں چلا جائے' غائب ہو جائے یا انتقال کر جائے تو کہا جاتا ہے ''خس کم جہاں پاک''۔ اور ہم نے ''خس کم ہنوز جہاں ناپاک'' تحریر کر کے جو تصرف کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ ہم اس مظلوم' محروم اور قابلِ رحم قوم کو بتانا چاہتے ہیں کہ ایک کرپٹ اور نااہل وزیراعظم کی رخصتی سے خس یقیناً کم ہوا ہے' لیکن ابھی جہاں پاک نہیں ہوا۔ خس نے چمن کا گھیراؤ کیا ہوا ہے۔ مکمل صفائی ابھی بہت دور کی بات لگتی ہے۔ اسے تو ہم بمشکل آغاز کہہ سکتے ہیں۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ دل کی بات کہیں تو حقیقت یہ ہے کہ ملک کیا ہے خس کا ایک ڈھیر ہے۔

گیلانی صاحب بڑی مشکل سے ایوانِ اقتدار سے نکلے ہیں' بلکہ صحیح تر الفاظ میں نکالے گئے ہیں۔ اقتدار سے چمٹے رہنے کی خواہش نے انہیں بہت رسوا کیا اور وہ کوچۂ اقتدار سے بڑے بے آبرو ہو کر نکلے ہیں۔ ان کی چار سالہ حکمرانی نے عوام کو مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کے سوا کچھ نہیں دیا۔ وہ خوش شکل تھے' اُجلے سوٹ پہنتے تھے' لیکن ان کا اندازِ حکمرانی انتہائی بدصورت تھا۔ انہوں نے داخلی سطح پر قوم کو اندھیروں میں دھکیل دیا اور خارجی سطح پر پاکستان کی ذلت و رسوائی میں اضافے کا باعث بنے۔ ہمارا ماضی گواہ ہے کہ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ چلے

جانے والوں کو برا بھلا کہا جائے یا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا جائے' لیکن اندازہ کیجیے کہ ہم اُس حکمران پر کن الفاظ میں تبصرہ کریں جس کے ملک کی خودمختاری اور آزادی کو ایک دوسرا ملک بُری طرح روند ڈالے اور یہاں آ کر اپنے کسی دشمن کو ہلاک کر دے اور وہ حکمران اسے عظیم فتح قرار دے۔ ہماری مراد اور ہمارا اشارہ ایبٹ آباد پر امریکی ہیلی کاپٹروں کے حملے کی طرف ہے۔ وہ کیسی بدقسمت قوم ہوگی اور وہ کتنا بدبخت حکمران ہوگا جو کسی دوسری قوت کو یہ پیغام دے کہ تم ڈرون حملے یا کسی بھی قسم کے حملے کرتے رہو' ہم عوامی سطح پر اور اسمبلی میں اس کی مذمت کرتے رہیں گے' لیکن آپ کے کام میں مزاحم نہیں ہوں گے۔ کسی حکمران کا ظاہری جسم کتنا ہی خوبصورت اور اس کی جِلد کتنی ہی گوری کیوں نہ ہو' لیکن اس کا باطن اگر اس قدر سیاہ ہو اور وہ بیت المال پر دن دہاڑے ڈاکہ زنی کرتا ہو' کسی سپر قوت کو اپنے عوام کا خون بطور تاوان ادا کرتا ہو اور اُس کے اہل خانہ قومی خزانے کو یوں لوٹ رہے ہوں جیسے غیر مہذب اور وحشی فوج مفتوح علاقے کو لوٹتی ہے تو ہم ایسے حکمران کی رخصتی پر رنجیدہ کیوں ہوں؟ ہاں ہم رنجیدہ ہیں' مگر اس بات پر کہ مستقبل قریب میں ہمیں اندازِ حکمرانی بدلتا نظر نہیں آتا۔ کرپشن کیسے اور کیوں ختم ہوگی؟ لوڈ شیڈنگ اور مہنگائی سے کیسے جان چھوٹے گی؟ اس لیے کہ گدی نشین تو چلا گیا' مگر کرپشن کا راجہ بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر آیا ہے اور برائی اور خرابی کی معراج تک پہنچنے کی خواہش لیے آیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں سرمایہ دارانہ نظام مغربی جمہوریت کو ڈھال بنا کر اپنے عزائم کی تکمیل کر رہا ہے۔ وہاں عوام کی اکثریت ایک گھوڑے کی مانند سرمایہ داری کے تانگہ میں جتی ہوتی ہے' لیکن وہاں کا تانگہ بان سمجھتا ہے کہ ارتکازِ دولت کے لیے اور اپنے اقتدار و کنٹرول کو مضبوط' مستحکم بلکہ دائمی بنانے کے لیے اس جُتے ہوئے گھوڑے (یعنی عوام کی اکثریت) کو زندہ ہی نہیں اتنا توانا بھی رکھنا ہوگا کہ ہمارا کام محنت و مشقت بلکہ کسی حد تک خوش دلی سے کر سکے۔ وہ مرغی کو ذبح نہیں کرنا چاہتے' وہ اس کے انڈے کھانا چاہتے ہیں۔ مغرب کا سرمایہ دار اپنے ابلیسی عزائم کی تکمیل میں کچھ اصول و ضوابط کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ باطل پر کچھ نہ کچھ حق کا رنگ نہ چڑھایا تو اس کی اصلیت جلد سامنے آ جائے گی۔ ہمارا ایمان ہے کہ حقیقت اور اصلیت تو پھر بھی سامنے آ جائے گی لیکن اس

(باقی صفحہ 94 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ التَّوبۃ

آیات ۳۰ تا ۳۵

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝

آیت ۳۰ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور یہود نے کہا (عقیدہ گھڑ لیا) کہ عزیرؑ اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا (عقیدہ

گھڑ لیا) کہ مسیحؑ اللہ کا بیٹا ہے۔‘‘

﴿ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ ’’یہ ان کے مُنہ کی باتیں ہیں۔ یہ نقل کر رہے ہیں ان لوگوں کی باتوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا ان سے پہلے۔‘‘

ان کی ان باتوں یا من گھڑت عقیدوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے‘ بلکہ یہ لوگ اپنے سے پہلے والے مشرکین کے عقائد کی نقل کر رہے ہیں۔ ’’متھرا ازم‘‘ ایک قدیم مذہب تھا جس کا مرکز مصر تھا۔ اس مذہب میں پہلے سے یہ تثلیث موجود تھی: "God the Father, Horus the Son of God and Isis the Mother Goddess." یعنی خدا‘ خدا کا بیٹا اور اس کی ماں آئسس دیوی۔ یہ پہلی تثلیث تھی جو مصر میں بنی۔ پھر جب سینٹ پال نے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور اس کا دائرہ غیر اسرائیلیوں (gentiles) تک وسیع کر دیا تو اہلِ مصر کی نقالی میں تثلیث جیسے نظریات عیسائیت میں شامل کر لیے گئے تاکہ اِن نئے لوگوں کو عیسائیت اختیار کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ عیسائیت میں جو پہلی تثلیث شامل کی گئی وہ یہی تھی کہ ’’خدا‘ خدا کا بیٹا یسوع اور مریم مقدس‘‘۔ تو انہوں نے قدیم مذاہب کی نقالی میں یہ تثلیث ایجاد کی تھی۔

﴿قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ ’’اللہ انہیں ہلاک کرے‘ یہ کہاں سے بچلائے گئے ہیں!‘‘

آیت ۳۱ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ﴾ ’’انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو ربّ بنا لیا اللہ کے سوا اور مسیحؑ ابن مریم کو بھی۔‘‘

عیسائیوں میں دوسری بڑی گمراہی یہ پیدا ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنے علماء و مشائخ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی الوہیت میں حصہ دار بنا لیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ان کے ہاں باقاعدہ تین خداؤں میں سے ایک تھے اور اس حیثیت میں وہ آپؑ کی پرستش بھی کرتے تھے‘ مگر احبار و رہبان کو رب ماننے کی کیفیت ذرا مختلف تھی۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ (جنہوں نے عیسائیت سے اسلام قبول کیا تھا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس آیت کے بارے میں وضاحت کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَمَا اِنَّهُمْ لَمْ يَكُوْنُوْا يَعْبُدُوْنَهُمْ وَلٰكِنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا اَحَلُّوْا شَيْئًا اس کا

اسْتَحَلُّوْهُ وَاِذَا حَرَّمُوْا عَلَيْهِمْ شَيْئًا حَرَّمُوْهُ))(۱)

''وہ ان (احبار ورہبان) کی عبادت تو نہیں کرتے تھے' لیکن جب وہ کسی شے کو حلال قرار دیتے تو یہ اسے حلال مان لیتے اور جب کسی شے کو حرام قرار دیتے تو اسے حرام مان لیتے۔''

یعنی حلال وحرام کے بارے میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے' اور اگر کوئی دوسرا اس حق کو استعمال کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی الوہیت میں حصہ دار بن رہا ہے' اور جو کوئی اللہ کے علاوہ کسی کا یہ حق تسلیم کرتا ہے وہ گویا اسے اللہ کے سوا اپنا رب تسلیم کر رہا ہے۔

آج بھی پوپ کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے فیصلہ کرے۔ جیسا کہ اُس نے ایک فرمان کے ذریعے سے یہودیوں کو دو ہزار سال پرانے اس الزام سے بری کر دیا' کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو سولی پر چڑھایا تھا۔ گویا اسے تاریخ تک کو بدل دینے کا اختیار ہے' اسی طرح وہ کسی حرام چیز کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے سکتا ہے۔ اس طرح کے تصورات ہمارے ہاں اسماعیلیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا امامِ حاضر معصوم ہوتا ہے اور اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال کر دے اور جس چیز کو چاہے حرام کر دے۔ اس طرح انہوں نے شریعت کو ساقط کر دیا ہے۔ تاہم یہ معاملہ بالخصوص گجرات (انڈیا) کے علاقے میں بسنے والے اسماعیلیوں کا ہے' جبکہ ہنزہ میں جو اسماعیلی آباد ہیں اُن کے ہاں شریعت موجود ہے' کیونکہ یہ پرانے اسماعیلی ہیں جو باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ گجرات (انڈیا) کے علاقہ میں اسماعیلیوں نے جب مقامی آبادی میں اپنے نظریات کی تبلیغ شروع کی تو انہوں نے وہی کیا جو سینٹ پال نے کیا تھا۔ انہوں نے شریعت کو ساقط کر دیا اور ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اوتار کا عقیدہ اپنا لیا۔ مقامی ہندو آبادی میں اپنے نظریات کی آسان ترویج کے لیے انہوں نے حضرت علی ؓ کو دسویں اوتار کے طور پر پیش کیا (ہندوؤں کے ہاں نو اوتار کا عقیدہ رائج تھا)۔ لہٰذا ''دشتم اوتار'' کا عقیدہ مستقل طور پر اُن کے ہاں رائج ہو گیا۔ اس کے علاوہ اُن کے حاضر امام کو مکمل اختیار ہے کہ وہ شریعت کے جس حکم کو چاہے منسوخ کر دے' کسی حلال چیز کو حرام کر دے یا کسی حرام کو حلال کر دے۔

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا

(۱) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن' باب ومن سورۃ التوبۃ۔

يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾ ''انہیں نہیں حکم دیا گیا تھا مگر اسی بات کا کہ وہ پوجیں صرف ایک الٰہ کو' نہیں ہے کوئی معبود اس کے سوا۔ وہ پاک ہے اس سے جو شرک یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

آیت ۳۲ ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ ''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے منہ (کی پھونکوں) سے''

﴿وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور اللہ کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے' چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

اس اسلوب میں یہودیوں پر ایک طرح کا طنز ہے کہ وہ خفیہ سازشوں کے ذریعے سے اس دین کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی علی الاعلان میدان میں آ کر مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس آیت کی ترجمانی مولانا ظفر علی خان نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کی ہے: ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن　　پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

آیت ۳۳ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر' خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

یہ آیت بہت واضح انداز میں محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی امتیازی یا تکمیلی شان کا مظہر ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے' حضور ﷺ کی رسالت کا بنیادی مقصد تو دوسرے انبیاء ورُسل کی طرح تبشیر' انذار' تذکیر' دعوت اور تبلیغ ہے' جس کا تذکرہ سورۃ النساء (آیت ۱۶۵) میں بایں الفاظ موجود ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ لیکن اس کے علاوہ حضور ﷺ کی بعثت کا ایک امتیازی اور خصوصی مقصد بھی ہے اور وہ ہے تکمیل رسالت' یعنی دین کو بالفعل قائم اور غالب کرنا۔ اِن دو آیات میں آپ ﷺ کی رسالت کی اسی تکمیلی شان کا ذکر ہے۔ آیات کا یہ جوڑا بالکل اسی ترتیب سے سورۃ الصّف (آیت ۸ اور ۹) میں بھی آیا ہے۔ ان میں سے پہلی آیت سورۃ الصّف میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ آئی ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ

الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾ جبکہ دوسری آیت جوں کی توں ہے' اس میں اور سورۃ التوبہ کی اس آیت میں بالکل کوئی فرق نہیں ہے۔ میں نے اس آیت پر چوبیس صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھا تھا جو ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے خصوصی یا امتیازی مقصد کی کلی انداز میں تکمیل یعنی دنیا میں دین کو قائم اور غالب کرنے کی جدّوجہد ہم سب پر حضور ﷺ کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے فرض ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے اس فرض سے جان چھڑانے کے لیے بھی دلائل دیے ہیں کہ دین کو ہم انسانوں نے نہیں بلکہ اللہ نے غالب کرنا ہے' لیکن اس کتاب کے مطالعے سے آپ پر واضح ہوگا کہ اس فرض سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

آیت ۳۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اے اہلِ ایمان' یقیناً بہت سے علماء اور درویش ہڑپ کرتے ہیں لوگوں کے مال باطل طریقے سے''

مختلف مسلمان اُمتوں میں مذہبی پیشواؤں کے لیے مختلف نام اور القاب رائج رہے ہیں۔ بنی اسرائیل کے ہاں انہیں احبار اور رہبان کہا جاتا تھا۔ آیت زیرِ نظر کے مطابق اس طبقے میں اکثریت ایسے لوگوں کی رہی ہے جو باطل اور ناجائز ذرائع سے مال و دولت جمع کرنے اور جائیداد بنانے کے مکروہ دھندے میں ملوث رہے ہیں۔ ایک عام دنیا دار آدمی جائز طریقے سے مال و دولت کماتا ہے یا جائیداد بناتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر ایک ایسا شخص جو دین کی خدمت میں مصروف ہے اور اسی حقیقت سے جانا پہچانا جاتا ہے' اگر وہ بھی مال و دولت جمع کرنے اور جائیداد بنانے میں مشغول ہو جائے' اور مزید یہ کہ دین کو استعمال کرتے ہوئے اور اپنی دینی حیثیت کو نیلام کرتے ہوئے لوگوں کے مال ہڑپ کرنے لگے اور مال و دولت جمع کرنے ہی کو اپنا مقصدِ زندگی بنالے' تو ایسا انسان آسمان کی چھت کے نیچے بدترین انسان ہوگا۔

اپنی امت کے علماء کے بارے میں حضور ﷺ کی ایک بہت عبرت انگیز حدیث ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((يُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ، وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ، مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى، عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ

مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ، مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ)) (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اندیشہ ہے کہ لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا جب اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ نہیں بچے گا اور قرآن میں سے اس کے رسم الخط کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ان کی مسجدیں بہت آباد (اور شاندار) ہوں گی مگر وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے' فتنہ انہی میں سے برآمد ہوگا اور ان ہی میں لوٹ جائے گا۔''

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور روکتے ہیں لوگوں کو اللہ کے راستے سے۔''

جب کوئی دینی تحریک اٹھتی ہے' کوئی اللہ کا مخلص بندہ لوگوں کو دین کی طرف بلاتا ہے' تو ان مذہبی پیشواؤں کو اپنی مسندیں خطرے میں نظر آتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے عقیدت مند انہیں چھوڑ کر کسی دوسری دعوت کی طرف متوجہ ہوں' کیونکہ انہی عقیدت مندوں کے نذرانوں ہی سے تو ان کے دولت کے انباروں میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے اور ان کی جائیدادیں بن رہی ہوتی ہیں۔ وہ آخر کیونکر چاہیں گے کہ اُن کے نام لیوا کسی دوسری دعوت پر لبیک کہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں اپنے پاس سونا اور چاندی اور خرچ نہیں کرتے اس کو اللہ کی راہ میں' تو ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔''

اس آیت کے حوالے سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنا مطلقاً حرام ہے۔ مگر دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' حضرت ابوذر غفاریؓ کی اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ چنانچہ دین کا عام قانون اس سلسلے میں یہی ہے کہ اگر کسی نے کوئی مال جائز طریقے سے کمایا ہو اور وہ اس میں سے زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو تو اس مال کو وہ اپنے پاس رکھا سکتا ہے' چاہے اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ ہو اور چاہے وہ سونے یا چاندی ہی کی شکل میں ہو۔ ایسا مال ایک شخص کی موت کے بعد اس کے ورثاء کو جائز مال کے طور پر قانونِ وراثت کے مطابق منتقل بھی ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانونِ وراثت خود اس بات پر دلیل ہے کہ مال و دولت کو اپنی ملکیت میں رکھنا ناجائز نہیں ہے' کیونکہ اگر مال جمع نہیں ہوگا تو وراثت

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب العلم' الفصل الثالث۔

کس چیز کی ہوگی اور قانونِ وراثت کا عملاً کیا مقصد رہ جائے گا؟ اس لحاظ سے قرآن کے وہ احکام روحانی اور اخلاقی تعلیم کے زمرے میں آتے ہیں جن میں بار بار مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس سلسلے میں ﴿قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ یعنی جو بھی زائد از ضرورت ہو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی مخالفت کے باوجود قانونی نقطہ نظر سے یہی فیصلہ ہوا تھا کہ سونا‘ چاندی اپنے پاس رکھنا مطلقاً حرام نہیں ہے‘ مگر حضرت ابوذر غفاریؓ اپنی رائے میں کسی قسم کی لچک پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ چونکہ آپؓ کے اختلاف کی شدت کے باعث مدینہ کے ماحول میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو رہی تھی‘ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپؓ کو حکم دیا کہ وہ مدینہ سے باہر چلے جائیں۔ اس پر آپؓ مدینہ سے نکل گئے اور صحرا میں ایک چھونپڑی بنا کر اس میں رہنے لگے۔

میرے نزدیک اس آیت کا حکم احبار اور رہبان یعنی مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جنہوں نے اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں دین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہیں اور اُن کا اپنا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ ایسے مذہبی پیشواؤں کو لوگ ہدیے دیتے ہیں اور اُن کی مالی معاونت کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کر سکیں۔ جیسے حضور ﷺ خود بیت المال سے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے‘ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو نان نفقہ بھی دیتے تھے اور اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک بھی کرتے تھے‘ مگر بیت المال سے کچھ میسّر نہ ہونے کی صورت میں فاقے بھی کرتے تھے۔ اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی مثال بھی ہے۔ چنانچہ ایسے مذہبی پیشواؤں پر بھی لازم ہے کہ وہ دوسروں کے ہدیے اور وظائف صرف معروف انداز میں اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے استعمال میں لائیں۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنی مذکورہ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دولت اکٹھی کرنا اور جائیدادیں بنانا شروع کر دیں‘ اور پھر یہ جائیدادیں قانونِ وراثت کے تحت اُن کے ورثاء کو منتقل ہوں تو ایسی صورت میں اِن لوگوں پر اس آیت کے احکام کا حرف بہ حرف انطباق ہوگا۔ چنانچہ آج بھی اگر آپ علمائے حق اور علمائے سو کے بارے میں معلوم کرنا چاہیں تو میرے نزدیک یہ آیت اس کے لیے ایک طرح کا لٹمس ٹیسٹ (litmus test) ہے۔ اگر کوئی مذہبی پیشوا یا عالم اپنے دینی کیریئر کے نتیجے میں

جائیداد بنا کر اور اپنے پیچھے دولت چھوڑ کر مرا ہو تو وہ بلاشک وشبہ علمائے سو میں سے ہے۔

آیت ۳۵ ﴿يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ﴾ ’’جس دن ان (سونے اور چاندی) کو تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں اور پھر داغا جائے گا ان سے ان کی پیشانیوں‘ ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو۔‘‘

﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵﴾ ’’(اور ساتھ کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے اکٹھا کیا تھا‘ تو اب چکھو مزا اس کا جو کچھ تم جمع کرتے تھے۔‘‘

آیات ۳۶‘ ۳۷

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

آیت ۳۶ ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ ’’بے شک اللہ کے ہاں مہینوں کی تعداد بارہ ہے‘ اللہ کے قانون میں‘ جس دن سے اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو‘‘

اللہ کے قائم کردہ تکوینی نظام اور تشریعی قانون کے تحت مہینوں کی تعداد بارہ مقرر کی گئی ہے۔

﴿مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ﴾ ’’ان میں سے چار مہینے محترم ہیں۔‘‘

ان چار مہینوں (ذوالقعدہ‘ ذوالحجہ‘ محرم اور رجب) کو ’’اشہرِ حُرُم‘‘ کہتے ہیں اور ان میں جنگ وغیرہ جائز نہیں۔

﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾ ”یہی ہے سیدھا دین‘ تو ان کے معاملے میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو“

قانونِ خداوندی کے مطابق یہ چار مہینے شروع سے محترم ہیں‘ لہٰذا تم لوگ ان مہینوں کے بارے میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔ اس میں قریش کے اس رواج کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت وہ محترم مہینوں کو اپنی مرضی سے بدلتے رہتے تھے۔ کسی مہم یا لڑائی کے دوران میں اگر کوئی ماہِ حرام آ جاتا تو اس مہینے کے احترام میں جنگ و جدال بند کرنے کے بجائے وہ اعلان کر دیتے کہ اس سال اس مہینے کے بجائے فلاں مہینہ ماہِ حرام کے طور پر منایا جائے گا۔ اس طرح انہوں نے پورا کیلنڈر گڈ مڈ کر رکھا تھا۔ لیکن مہینوں کے اَدل بدل اور الٹ پھیر سے گزرتے ہوئے قدرتِ خداوندی سے ۱۰ ہجری میں کیلنڈر واپس اپنی اصلی حالت پر پہنچ گیا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا: ((اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ......))[1] یعنی زمانے کی یہ تقویم (کیلنڈر) پورا چکر لگا کر ساری غلطیوں اور ترامیم میں سے گزرتے ہوئے اب ٹھیک اسی جگہ پر پہنچ گئی ہے جس پر اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔

﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۳۶﴾ ”اور مشرکین سے سب مل کر جنگ کرو جیسے وہ سب اکٹھے ہو کر تم سے جنگ کرتے ہیں‘ اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“

آیت ۳۷ ﴿اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ”یہ مہینوں کو ہٹا کر آگے پیچھے کر لینا تو کفر میں ایک اضافہ ہے‘ جس کے ذریعے سے گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا“

یعنی امن کے مہینوں کو اپنی جگہ سے ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں مزید ایک کافرانہ حرکت ہے۔

﴿يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِــــُٔــوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ﴾ ”ایک سال

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق و کتاب المغازی و کتاب تفسیر القرآن‘ باب قولہ ان عدۃ الشھور عند اللّٰہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللّٰہ ...... وصحیح مسلم‘ کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات‘ باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

حلال کر لیتے ہیں اس (مہینے) کو اور ایک سال اسے حرام قرار دیتے ہیں‘ تا کہ تعداد پوری کر لیں اس کی جو اللہ نے حرام ٹھہرائے ہیں“

﴿فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ﴾ ”اور (اس طرح) حلال کر لیتے وہ (مہینہ) جو اللہ نے حرام کیا ہے۔“

یعنی اس طرح اُلٹ پھیر کر کے وہ ان مہینوں کو حلال کر لیتے جو اصل میں اللہ نے حرام ٹھہرائے ہیں۔ مشرکین عرب بھی بارہ مہینوں میں سے چار مہینوں کو محترم مانتے تھے مگر اپنی مرضی سے ان مہینوں کو آگے پیچھے کرتے رہتے اور سال کے آخر تک ان کی تعداد پوری کر دیتے۔

﴿زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۳۷﴾ ”(اسی طرح) ان کے لیے مزیّن کر دیے گئے اُن کے برے اعمال۔ اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

یہاں وہ پانچ رکوع ختم ہوئے جن کا تعلق نبی اکرم ﷺ کی بعثتِ خصوصی سے ہے۔ اِن آیات میں اس سلسلے میں تکمیلی اور آخری احکام دے دیے گئے ہیں۔ اب چھٹے رکوع سے غزوۂ تبوک کے موضوع کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کے پس منظر کے ضمن میں چند باتیں پھر سے ذہن میں تازہ کر لیں۔

سن ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے عرب سے باہر مختلف فرمانرواؤں کی طرف اپنے خطوط اور ایلچی بھیجنے شروع کیے۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ کا نامۂ مبارک بصریٰ (شام) کے رئیس شرحبیل بن عمرو کی طرف بھی بھیجا گیا۔ یہ شخص رومن ایمپائر کا باج گزار تھا۔ اس کے پاس حضور ﷺ کا نامۂ مبارک حضرت حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے۔ شرحبیل نے تمام اخلاقی و سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو شہید کرا دیا۔ لہٰذا سفیر کے قتل کو اعلانِ جنگ سمجھتے ہوئے حضور ﷺ نے تین ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک لشکر تیار کر کے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت شام کی طرف بھیجا۔ جب یہ لشکر مُوتہ پہنچا تو انہوں نے ایک لاکھ رومیوں کا لشکر اپنے خلاف صف آرا پایا۔ مخالف لشکر کی تعداد کا اندازہ کرنے کے بعد مسلمانوں میں مقابلہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں مشورہ ہوا۔ چنانچہ شوقِ شہادت میں انہوں نے مقابلے کا فیصلہ کیا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن — نہ مالِ غنیمت‘ نہ کشور کشائی! (اقبالؒ)

جمادی الاولیٰ ۸ ہجری کو ان دونوں لشکروں کے درمیان مُوتہ کے مقام پر جنگ ہوئی۔ مسلمان لشکر کے لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کے علاوہ خصوصی طور پر دو مزید کمانڈر بھی مقرر فرمائے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب (جعفر طیارؓ) کمان سنبھالیں گے' اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ لشکر کے امیر ہوں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے مقرر کردہ تینوں کمانڈر اسی ترتیب سے یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے از خود لشکر کی کمان سنبھالی' اور کامیاب حکمتِ عملی کے تحت اپنے لشکر کو رومیوں کے نرغے سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنگ مُوتہ سے پیدا ہونے والی صورت حال میں حضور ﷺ نے اعلانِ عام فرمایا کہ رومیوں کے مقابلے کے لیے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لاتے ہوئے ایک بڑا لشکر تبوک کے لیے روانہ کیا جائے۔ اس مرتبہ آپ ﷺ نے خود لشکر کے ساتھ جانے کا فیصلہ فرمایا۔ تبوک مدینہ سے شمال کی جانب تقریباً ساڑھے تین سو میل کی مسافت پر حجاز کا آخری شہر ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں سے آگے اس زمانے میں رومن ایمپائر کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ غزوۂ تبوک میں شرکت کے لیے آپ ﷺ نے اعلانِ عام فرمایا تھا۔ یعنی جنگ کے قابل ہر صاحبِ ایمان شخص کے لیے فرض تھا کہ وہ اس مہم میں شریک ہو۔ یہ اہلِ ایمان کے لیے سخت امتحان اور آزمائش کا وقت تھا۔ قحط کا زمانہ' شدید گرمی کا موسم' طویل صحرائی سفر' وقت کی سپر پاور سے مقابلہ اور سب پر مستزاد یہ کہ فصل سنبھالنے کا موسم سر پر کھڑا تھا۔ گویا ایک سے بڑھ کر ایک مسئلہ تھا اور ایک سے بڑھ کر ایک امتحان! مدینہ کے بیشتر لوگوں کی سال بھر کی معیشت کا دارومدار کھجور کی فصل پر تھا' جو اس وقت پک کر تیار کھڑی تھی۔ مہم پر نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ پکی ہوئی کھجوروں کو درختوں پر ہی چھوڑ کر جانا ہوگا۔ عورتیں چونکہ کھجوروں کو درختوں سے اتارنے کا مشکل کام نہیں کر سکتی تھیں' اس لیے پکی پکائی فصل ضائع جاتی صاف نظر آ رہی تھی۔

دوسری طرف اس مہم کا اعلان منافقین پر بہت بھاری ثابت ہوا اور ان کی ساری خباثتیں اس کی وجہ سے طشت از بام ہو گئیں۔ چنانچہ آئندہ گیارہ رکوعوں کی آیات اپنے اندر اس سلسلے کے چھوٹے بڑے بہت سے موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں' مگر دوسرے مضامین کے درمیان میں ایک مضمون جو مسلسل چل رہا ہے وہ منافقین کا تذکرہ ہے۔ گویا یہ مضمون ایک دھاگہ ہے جس

میں دوسرے مضامین موتیوں کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے سورۃ النساء میں منافقین کا ذکر بڑی تفصیل سے آ چکا ہے' لیکن آئندہ گیارہ رکوع اس موضوع پر قرآن کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتے ہیں۔

بہرحال رسول اللہ ﷺ تیس ہزار کا لشکر لے کر تبوک تشریف لے گئے۔ مقابل میں اگرچہ ہرقل (قیصر روم) بنفس نفیس موجود تھا' لیکن شاید وہ پہچان چکا تھا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں' چنانچہ وہ مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ حضور ﷺ نے کچھ عرصہ تبوک میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں اردگرد کے بہت سے قبائل نے آ کر آپؐ سے معاہدے کیے۔ اس مہم میں اگرچہ جنگ کی نوبت نہ آئی مگر مسلمان لشکر کا مدینہ سے تبوک جا کر رومن ایمپائر کی سرحدوں پر دستک دینا اور ہرقل کا مقابلہ کرنے کی بجائے کنی کترا جانا' کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ چنانچہ نہ صرف اس علاقے میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی بلکہ اسلامی ریاست کی سرحدیں عملی طور پر تبوک تک وسیع ہو گئیں۔ دوسری طرف جنگ موتہ کی وجہ سے مسلمانوں کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی بھرپور انداز میں تلافی ہو گئی۔ سلطنتِ روم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا یہ سلسلہ جو غزوۂ تبوک کی صورت میں شروع ہوا' اس میں مزید پیش رفت دورِ صدیقیؓ میں ہوئی۔ حضور ﷺ کے وصال کے فوراً بعد مدینہ سے لشکر اسامہؓ کی روانگی بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی۔

آیات ۳۸ تا ۴۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـــًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ
وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ
يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

آیت ۳۸ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ﴾ ’’اے ایمان کے دعوے دارو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں تو تم دھنسے جاتے ہو زمین کی طرف۔‘‘

اگرچہ یہ وضاحت سورۃ النساء میں بھی ہو چکی ہے مگر اس نکتے کو دوبارہ ذہن نشین کر لیں کہ قرآن حکیم میں منافقین سے خطاب ’’يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا‘‘ کے صیغے میں ہی ہوتا ہے‘ کیونکہ ایمان کا دعویٰ تو وہ بھی کرتے تھے اور قانونی اور ظاہری طور پر وہ بھی مسلمان تھے۔

﴿اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ ’’(سوچو!) کیا تم نے آخرت کی بجائے دُنیا کی زندگی کو قبول کر لیا ہے؟‘‘

یہ بھی ایک متجسّسانہ سوال (searching question) ہے۔ یعنی تم دعویدار تو ہو ایمان بالآخرت کے‘ لیکن اگر تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنے کو تیار نہیں ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آخرت ہاتھ سے دے کر دنیا کے خریدار بننے جا رہے ہو۔ تم آخرت کی نعمتوں کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو۔

﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۳۸﴾ ’’تو (جان لو کہ) دنیا کی زندگی کا ساز و سامان آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔‘‘

آیت ۳۹ ﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ﴾ ’’اگر تم نہیں نکلو گے (اللہ کی راہ میں تو) وہ تمہیں عذاب دے گا دردناک عذاب اور تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا‘ اور تم اس کا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکو گے۔‘‘

اللہ کو تو اپنے دین کا جھنڈا اُٹھوانا ہے‘ اگر تم نہیں اٹھاؤ گے تو تمہیں ہٹا کر اس مقصد کے لیے کسی اور قوم کو آگے لے آئے گا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۰﴾ ’’اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

آیت ۴۰ ﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ﴾ ’’اگر تم ان (رسول اللہ ﷺ) کی مدد نہیں کرو گے تو (کچھ پروا نہیں) اللہ نے تو اُس وقت انؐ کی مدد کی تھی‘‘

﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ ’’جب کافروں نے انؐ کو (مکہ سے) نکال دیا تھا (اس حال میں کہ) آپؐ دو میں کے دوسرے تھے‘ جب کہ وہ دونوں غار میں تھے‘‘

یعنی وہ صرف دو اشخاص تھے‘ محمدؐ رسول اللہ ﷺ خود اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ ’’جبکہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو‘ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔‘‘

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ حضورؐ یہ لوگ تو غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں‘ اگر کسی نے ذرا بھی نیچے جھانک کر دیکھ لیا تو ہم نظر آ جائیں گے‘ تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ غم اور فکر مت کریں‘ اللہ ہمارے ساتھ ہے!

﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ ’’تو اللہ نے اپنی سکینت نازل فرمائی انؐ پر اور انؐ کی مدد فرمائی ان لشکروں سے جنہیں تم نہیں دیکھتے‘‘

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ﴾ ’’اور کافروں کی بات کو پست کر دیا۔‘‘

اس واقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر کافر زیر ہو گئے اور پورے جزیرہ نمائے عرب کے اندر اللہ کا دین غالب ہو گیا۔

﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۰﴾ ’’اور اللہ ہی کا کلمہ سب سے اونچا ہے‘ اور اللہ زبردست ہے‘ حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۴۱ ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ ’’نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل‘‘

یہ جو ہلکے اور بوجھل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس سے ان لوگوں کی کیفیت مراد ہے‘ اور اس کیفیت کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک پہلو تو داخلی ہے‘ یعنی بوجھل دل کے ساتھ نکلو یا آمادگی کے ساتھ‘ اب نکلنا تو پڑے گا‘ کیونکہ اب بات صرف تحریض و ترغیب تک نہیں رہی‘ بلکہ جہاد کے لیے نفیر عام ہو چکی ہے‘ لہٰذا اب اللہ کے رستے میں نکلنا فرضِ عین ہو چکا ہے۔ اس کا

دوسرا پہلو خارجی ہے اور اس پہلو سے مفہوم یہ ہوگا کہ چاہے تمہارے پاس ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ کافی ہے تب بھی نکلو اور اگر ساز و سامان کم ہے تب بھی۔

﴿وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۱﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔''

آیت ۴۲ ﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ﴾ ''اگر مالِ غنیمت قریب ہوتا اور سفر بھی چھوٹا ہوتا تو (اے نبی ﷺ) یہ آپ کی پیروی کرتے، لیکن ان کو تو بڑی بھاری پڑ رہی ہے دُور کی مسافت۔''

اگر ان منافقین کو توقع ہوتی کہ مالِ غنیمت آسانی سے مل جائے گا اور ہدف بھی کہیں قریب ہوتا تو یہ لوگ ضرور آپؐ کا ساتھ دیتے، مگر اب تو حالت یہ ہے کہ تبوک کی مسافت کا سن کر ان کے دل بیٹھے جا رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپؐ کسی بھی مہم کے ہدف وغیرہ کو ہمیشہ صیغہ راز میں رکھتے تھے۔ جنگ یا مہم کے لیے نکلنا ہوتا تو تیاری کا حکم دے دیا جاتا، مگر یہ نہ بتایا جاتا کہ کہاں جانا ہے اور منصوبہ کیا ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کے منصوبہ کو بھی آخر وقت تک خفیہ رکھا گیا تھا۔ مگر غزوۂ تبوک کی تیاری کے حکم کے ساتھ ہی آپؐ نے تمام تفصیلات بھی علی الاعلان سب کو بتا دی تھیں کہ لشکر کی منزلِ مقصود تبوک ہے اور ہمارا ٹکراؤ سلطنتِ روما سے ہے، تاکہ ہر شخص ہر لحاظ سے اپنا جائزہ لے لے اور داخلی و خارجی دونوں پہلوؤں سے تیاری کر لے۔ ساز و سامان بھی مہیا کر لے اور اپنے حوصلے کی بھی جانچ پرکھ کر لے۔

﴿وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ﴾ ''اور عنقریب یہ لوگ قسمیں کھائیں گے اللہ کی کہ اگر ہمارے اندر استطاعت ہوتی تو ہم ضرور نکلتے تم لوگوں کے ساتھ۔''

یعنی قسمیں کھا کھا کر بہانے بنائیں گے اور اپنی فرضی مجبوریوں کا رونا روئیں گے۔

﴿يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۴۲﴾ ''یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں، اور اللہ کو معلوم ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

آیات ۴۳ تا ۶۰

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۴۳ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝۴۴ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝۴۵ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝۴۶ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۴۸ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۴۹ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝۵۲ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۵۳ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۵۴ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ
مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا
اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا
مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ
اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ
اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ
عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ
السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

آیت ۴۳ ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) اللہ آپ کو معاف فرمائے (یا اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا) آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی؟''

یعنی آپ ﷺ کے پاس کوئی منافق آیا اور اپنی کسی مجبوری کا بہانہ بنا کر جہاد سے رخصت چاہی تو آپ ﷺ نے اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے اسے اجازت دے دی۔ اب اس شخص کو تو گویا سند مل گئی کہ میں نے حضور ﷺ سے رخصت لی ہے۔ جہاد کے لیے نکلنے کا ارادہ تو اس کا تھا ہی نہیں، مگر اجازت مل جانے سے اس کی منافقت کا پردہ چاک نہیں ہوا۔ اجازت نہ ملتی تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا کہ اُس نے حضور ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی ہے۔ اس طرح کئی منافقین آئے اور اپنی مجبوریوں کا بہانہ بنا کر آپ ﷺ سے رخصت لے گئے۔

﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ ''یہاں تک کہ آپؐ کے لیے واضح ہو جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور آپؐ (یہ بھی) جان لیتے کہ کون جھوٹے ہیں۔''

آیت ۴۴ ﴿لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ﴾ ''وہ لوگ جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپؐ سے اجازت کے طالب ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ جہاد نہ کریں اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔''

سچے مؤمن ایسی صورتِ حال میں ایسا کبھی نہیں کر سکتے کہ وہ جہاد سے معافی کے لیے درخواست کریں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ایمان کی جو تعریف (definition) کی گئی ہے اس میں تصدیقِ قلبی اور جہاد فی سبیل اللہ کو ایمان کے ارکان قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت کا ذکر سورۃ الانفال کی آیت ۲ اور آیت ۷۴ کے ضمن میں بھی گزر چکا ہے۔ اس میں جہاد فی سبیل اللہ کو واضح طور پر ایمان کی لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ﴾ ''اور اللہ متقی بندوں سے خوب واقف ہے۔''

آیت ۴۵ ﴿اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ''آپؐ سے رخصت تو وہی مانگ رہے ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور ان کے دل شکوک میں پڑ گئے ہیں''

یہاں سورۃ الحجرات کی مذکورہ آیت کے الفاظ ''ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا'' ذہن میں دوبارہ تازہ کر لیجیے کہ مؤمن تو وہی ہیں جو ایمان لانے کے بعد شک میں نہ پڑیں، اور یہاں ''وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ'' کے الفاظ سے واضح فرما دیا کہ ان منافقین کے دلوں کے اندر تو شکوک و شبہات مستقل طور پر ڈیرے ڈال چکے ہیں۔

﴿فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ﴾ ''اور وہ اپنے اسی شک و شبہ کے اندر متردّد ہیں۔''

اپنے ایمان کے اندر پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کی وجہ سے وہ تذبذب میں پڑے ہوئے ہیں اور جہاد کے لیے نکلنے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پا رہے۔ کبھی اُن کو مسلمانوں کے ساتھ چلنے میں مصلحت نظر آتی کہ نہ جانے سے ایمان کا ظاہری بھرم بھی جاتا رہے گا، مگر پھر فوراً ہی مسافت کی مشقت کے تصور سے دل بیٹھ جاتا، دُنیوی مفادات کا تصور پاؤں کی بیڑی بن جاتا اور پھر سے جھوٹے بہانے بننے شروع ہو جاتے۔

آیت ۴۶ ﴿وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً﴾ ''اور اگر انہوں نے نکلنے کا ارادہ کیا ہوتا تو اس کے لیے ساز و سامان فراہم کرتے''

ایسے طویل اور کٹھن سفر کے لیے بھرپور تیاری کی ضرورت تھی، بہت سا ساز و سامان درکار تھا، مگر اس کے لیے اُن کا کچھ بھی تیاری نہ کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا خود ہی ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے جانے کا ارادہ تک نہیں کیا۔

﴿وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے پسند ہی نہیں کیا اُن کا اٹھنا (اور نکلنا) تو ان کو روک دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھے رہو تم بھی بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ۔''

اس فرمان میں جو حکمت تھی اس کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی گئی:

آیت ۴۷ ﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا﴾ ''اگر یہ نکلتے (اے مسلمانو!) تمہارے ساتھ تو ہرگز اضافہ نہ کرتے تمہارے لیے مگر خرابی ہی کا''

اُن کے دلوں میں چونکہ روگ تھا' اس لیے لشکر کے ساتھ جا کر بھی یہ لوگ فتنے ہی اٹھاتے' لڑائی جھگڑا کرانے کی کوشش کرتے اور سازشیں کرتے۔ لہٰذا ان کے بیٹھے رہنے اور سفر میں آپ لوگوں کے ساتھ نہ جانے میں بھی بہتری پوشیدہ تھی۔ گویا بندۂ مؤمن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر طرح خیر ہی خیر ہے' جبکہ منافق کے لیے ہر حالت میں شر ہی شر ہے۔

﴿وَّلَاۤ اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ﴾ ''اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے مابین' فتنہ پیدا کرنے کے لیے۔''

﴿وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور تمہارے اندر ان کے جاسوس بھی ہیں۔ اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔''

اس کا دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ ''تمہارے درمیان ان کی باتیں سننے والے بھی ہیں''۔ یعنی تمہارے درمیان ایسے نیک دل اور سادہ لوح مسلمان بھی ہیں جو ان منافقین کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کے اِن منافقین کے ساتھ دوستانہ مراسم بھی ہیں اور وہ ان کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ منافقین تمہارے ساتھ لشکر میں موجود ہوتے اور کوئی فتنہ اٹھاتے تو عین ممکن تھا کہ تمہارے وہ ساتھی اپنی سادہ لوحی کے باعث اُن کے اٹھائے ہوئے فتنے کا شکار ہو جاتے۔

آیت ۴۸ ﴿لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''یہ پہلے بھی فتنہ اٹھاتے رہے ہیں''

یاد رہے کہ یہی لفظ ''فتنہ'' اس حدیث میں بھی آیا ہے جس کا ذکر علمائے سو کے کردار کے سلسلے میں قبل ازیں آیت ۳۴ کے ضمن میں ہو چکا ہے: ((عُلَمَاءُ هُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ)) یعنی ان کے علماء آسمان کے نیچے بدترین

لوگ ہوں گے' فتنہ ان ہی میں سے برآمد ہوگا اور ان ہی میں پلٹ جائے گا''۔ یعنی وہ آپس میں لڑائی جھگڑوں' فتویٰ پردازیوں اور تفرقہ بازیوں میں مصروف ہوں گے۔

﴿وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ کے لیے معاملات کو الٹ پلٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں''

یہ لوگ اپنی امکانی حد تک کوشش کرتے رہے ہیں کہ آپ ﷺ کے معاملات کو تلپٹ کر دیں۔

﴿حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا امر غالب ہو گیا اور انہیں یہ پسند نہیں تھا۔''

یعنی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک ان لوگوں کی خواہشوں اور کوششوں کے علی الرغم اللہ کا دین غالب ہو گیا۔

آیت ۴۹ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ﴾ ''اور ان میں سے وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجیے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالیے۔''

یہ منافق اور مردود شخص جُد بن قیس تھا (لعنۃ اللہ علیہ)۔ جب رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے لیے تیاری کا اعلان فرمایا تو یہ شخص آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عجیب استہزائیہ انداز میں آپ ﷺ سے رخصت چاہی کہ حضور مجھے تو رہنے ہی دیں' کیونکہ میں حسن پرست قسم کا انسان ہوں اور لشکر جا رہا ہے شام کے علاقے کی طرف' جہاں کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں۔ میں وہاں کی خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکوں گا اور فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں گا' لہٰذا آپ مجھے اس فتنے میں مت ڈالیں اور مجھے پیچھے ہی رہنے دیں۔

﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ فتنے میں تو یہ لوگ پڑ چکے۔''

یعنی یہ شخص اور اس کے دوسرے ساتھی تو پہلے ہی بدترین فتنے کا شکار ہو چکے ہیں جو اس طرح کے بہانے تراشنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ جس سوچ کی غمازی کر رہا ہے اس سے مزید بڑا فتنہ اور کون سا ہوگا!

﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور یقیناً جہنم ان کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

آیت ۵۰ ﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ) اگر آپ کو کوئی اچھی

بات پہنچتی ہے تو انہیں وہ بری لگتی ہے۔''

اگر آپ ﷺ کو کہیں سے کوئی کامیابی ملتی ہے' کوئی اچھی خبر آپؐ کے لیے آتی ہے تو انہیں یہ سب کچھ ناگوار لگتا ہے۔

﴿وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور اگر آپؐ کو کوئی تکلیف آجاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو اپنا معاملہ پہلے ہی درست کرلیا تھا''

کہ ہم کوئی ان لوگوں کی طرح بے وقوف تھوڑے ہیں' ہم نے تو پہلے ہی ان برے حالات سے اپنی حفاظت کا بندوبست کرلیا تھا۔

﴿وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰﴾ ''اور وہ لوٹ جاتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے۔''

وہ اس صورتِ حال میں بڑے شاداں وفرحاں پھرتے ہیں کہ مسلمانوں پر مصیبت آگئی اور ہم بچ گئے۔

اگلی دو آیات معرکہ حق و باطل میں ایک بندۂ مؤمن کے لیے بہت بڑا ہتھیار ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کو یہ دونوں آیات زبانی یاد کرلینی چاہئیں۔

آیت ۵۱ ﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہو۔ وہی ہمارا مولا ہے۔''

ہم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اللہ ہی کی مرضی اور اجازت سے آتی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کائنات میں ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ وہ ہمارا کارساز اور پروردگار ہے۔ اگر اس کی مشیت ہو کہ ہمیں کوئی تکلیف آئے تو سر آنکھوں پر ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''۔ جو اس کی رضا ہو ہم بھی اسی پر راضی ہیں۔ اگر اُس کی طرف سے کوئی تکلیف آجائے تو اس میں بھی ہمارے لیے خیر ہے ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است'' (ہمارا ساقی ہمارے پیالے میں جو بھی ڈال دے اس کا لطف وکرم ہی ہے)۔ محبوب کی شمشیر سے ذبح ہونا یقیناً بہت بڑے اعزاز کی بات ہے اور یہ اعزاز کسی غیر کے نصیب میں کیوں ہو' جبکہ ہماری گردنیں ہر وقت اس سعادت کے لیے حاضر ہیں: ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تُو خنجر آزمائی!

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱﴾ ''اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے اہلِ ایمان کو۔''

آیت ۵۲ ﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ﴾ ''(ان سے) کہیے کہ تم ہمارے بارے میں کس شے کا انتظار کرسکتے ہو سوائے دو نہایت عمدہ چیزوں میں سے کسی ایک کے!''

الْحُسْنَيَيْنِ ' الْحُسْنٰی کی تثنیہ ہے' جو اَحْسَن کی مؤنث ہے۔ یہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ چنانچہ الْحُسْنَيَيْنِ کے معنی ہیں دو نہایت احسن صورتیں۔ جب کوئی بندۂ مؤمن اللہ کے راستے میں کسی مہم پر نکلتا ہے تو اس کے لیے تو دونوں امکانی صورتیں ہی احسن ہیں' اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں تو وہ بھی احسن: ؎

شہادت ہے مطلوب ومقصودِ مؤمن نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی! (اقبالؔ)

اور اگر کامیاب ہو کر آجائیں تو بھی احسن۔ دونوں صورتوں میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ تیسری کوئی صورت تو ہے ہی نہیں۔ لہٰذا ایک بندۂ مؤمن کو خوف کاہے کا؟ ؎

جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگرؔ
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

﴿وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ﴾ ''اور (اے منافقو!) ہم منتظر ہیں تمہارے بارے میں کہ اللہ تمہیں پہنچائے کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں''

ہمیں بھی تمہارے بارے میں انتظار ہے کہ تمہارے کرتوتوں کے سبب اللہ تعالیٰ تم پر خود کوئی عذاب نازل کردے یا عین ممکن ہے کہ کبھی ہمیں اجازت دے دی جائے اور ہم تمہاری گردنیں اڑائیں۔

﴿فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝۵۲﴾ ''تو تم بھی انتظار کرو' ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔''

آیت ۵۳ ﴿قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۵۳﴾ ''کہہ دیجیے کہ چاہے خوشی سے خرچ کرو یا مجبوری سے' تم سے قبول نہیں کیا

جائے گا۔اس لیے کہ تم نافرمان لوگ ہو۔‘‘

یہاں منافقین کے ایک دوسرے حربے کا ذکر ہے کہ کچھ مال اسباب چندے کے طور پر لے آئے اور بہانہ بنایا کہ مجھے فلاں فلاں مجبوری ہے‘ میں خود تو جانے سے معذور ہوں‘ مجھے رخصت دے دیں اور یہ ساز و سامان قبول کر لیں۔ ایسی صورتِ حال کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اب جبکہ جہاد کے لیے بنفس نفیس نکلنا فرضِ عین ہے‘ اس صورتِ حال میں روپیہ پیسہ اور ساز و سامان اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔

آیت ۵۴ ﴿وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ﴾ ’’اور نہیں مانع ہوئی کوئی چیز کہ ان سے ان کے نفقات (اموال کا خرچ کرنا) کو قبول کیا جاتا‘ مگر یہ کہ انہوں نے کفر کیا ہے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ‘‘

﴿وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴾ ’’اور وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر بہت ہی کسل مندی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر کراہت کے ساتھ۔‘‘

یعنی اب جو چندہ یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہ تو جان بچانے کے لیے دے رہے ہیں کہ ہم سے ساز و سامان لے لیا جائے اور ہمیں اس مہم پر جانے سے معاف رکھا جائے۔

آیت ۵۵ ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) آپ کو ان کے اموال اور ان کی اولاد سے تعجب نہ ہو۔‘‘

ان کو دیکھ کر آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مال و دولت اور اولاد کی کثرت ان کے لیے اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے‘ بلکہ ایسے لوگوں کو تو اللہ ایسی نعمتیں اس لیے دیتا ہے کہ ان کا حساب اسی دنیا میں بے باق ہو جائے اور آخرت میں ان کے لیے کچھ نہ بچے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات دنیا کی انہی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ انسان کے لیے باعث عذاب بنا دیتا ہے۔

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ’’اللہ تو چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعے سے انہیں دُنیوی زندگی میں عذاب دے‘‘

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ یہی اولاد جس کو انسان بڑے لاڈ پیار اور ارمانوں سے پال پوس کر بڑا کرتا ہے اس کے لیے سوہانِ روح بن جائے اور یہی

مال و دولت جسے وہ جان جوکھوں میں ڈال کر جمع کرتا ہے اس کی جان کا وبال ثابت ہو۔

﴿وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ ’’اور ان کی جانیں نکلیں اسی کفر کی حالت میں۔‘‘

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی میں اپنی دولت ہی سے لپٹے رہیں اور اپنی اولاد کی محبت میں اس قدر مگن رہیں کہ جیتے جی انہیں آنکھ کھول کر حق کو دیکھنے اور پہچاننے کی فرصت ہی نصیب نہ ہو‘ اور اسی حالت میں یہ لوگ آخری عذاب کے مستحق بن جائیں۔

آیت ۵۶ ﴿وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ﴾ ’’اور وہ قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔‘‘

ہم بھی مسلمان ہیں‘ آپ لوگوں کے ساتھی ہیں‘ ہماری بات کا اعتبار کیجیے۔

﴿وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ﴾ ’’لیکن (اے مسلمانو! حقیقت میں) یہ لوگ تم میں سے نہیں ہیں‘ بلکہ اصل میں یہ ڈرے ہوئے لوگ ہیں۔‘‘

اصل میں یہ لوگ اسلام کے غلبے کے تصور سے خوفزدہ ہیں اور خوف کے مارے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے ہیں۔

آیت ۵۷ ﴿لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ﴾ ’’اگر یہ پالیں کہیں کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا کوئی سر چھپانے کی جگہ‘ تو یہ اس کی طرف بھاگ جائیں اپنی رسّیاں تڑاتے ہوئے۔‘‘

جیسے کوئی جانور خوف کے مارے اپنی رسّی تڑا کر بھاگتا ہے‘ اسی طرح کی کیفیت ان پر بھی طاری ہے۔ اس اضطراری کیفیت میں اگر جزیرہ نمائے عرب میں انہیں کہیں بھی کوئی پناہ گاہ مل جاتی یا کسی بھی طرح کا کوئی ٹھکانہ جان بچانے کے لیے نظر آ جاتا تو وہ خوف کے مارے یہاں سے بھاگ گئے ہوتے۔

آیت ۵۸ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ) ان میں سے وہ بھی ہیں جو آپ پر الزام لگاتے ہیں صدقات کے بارے میں۔‘‘

زکوٰۃ و صدقات کا مال رسول اللہ ﷺ خود تقسیم فرماتے تھے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ مال کی تقسیم کے دوران ایک منافق نے آپ ﷺ کو ٹوک دیا: يَا مُحَمَّدُ اعْدِلْ ’’اے محمدؐ انصاف

(کے ساتھ تقسیم) کیجیے!'' اس کی مراد یہ تھی کہ آپ ناانصافی کر رہے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ کو غصہ آیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَيْلَكَ وَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ أَكُنْ أَعْدِلُ.....))(۱) ''تم برباد ہو جاؤ' اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟''

﴿فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝۵۸﴾ ''تو اگر اس میں سے انہیں (خاطر خواہ) دے دیا جائے تو یہ راضی رہتے ہیں اور اگر اس میں سے انہیں (اس قدر) نہ دیا جائے تو فوراً ناراض ہو جاتے ہیں۔''

آیت ۵۹ ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝۵۹﴾ ''اور اگر وہ راضی رہتے اس پر جو کچھ دیا انہیں اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے' اور وہ کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے' عنقریب اللہ اور اس کے رسولؐ ہمیں (پھر بھی) اپنے فضل سے نوازتے رہیں گے' یقیناً ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں (تو ان کے حق میں بہتر ہوتا)۔''

اگر ان لوگوں کی سوچ مثبت ہوتی اور وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بارے میں اچھا گمان رکھتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ اب وہ مشہور آیت آ رہی ہے جس میں زکوٰۃ کے مصارف بیان ہوئے ہیں۔

آیت ۶۰ ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا﴾ ''صدقات تو بس مفلسوں اور محتاجوں اور عاملین صدقات کے لیے ہیں''

صدقات سے مراد یہاں زکوٰۃ ہے۔ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا میں محکمہ زکوٰۃ کے چھوٹے بڑے تمام ملازمین شامل ہیں جو زکوٰۃ اکٹھی کرنے' اس کا حساب رکھنے اور اسے مستحقین میں تقسیم کرنے یا اس محکمہ میں کسی بھی حیثیت میں مامور ہیں' ان سب ملازمین کی تنخواہیں اسی زکوٰۃ میں سے دی جائیں گی۔

﴿وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ ''اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلوب مطلوب ہو''

جب دین کی تحریک اور دعوت چل رہی ہو تو معاشرے کے بعض صاحبِ حیثیت افراد کی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب ما جاء فی قول الرجل ویلك۔ وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب ذکر الخوارج وصفاتھم۔ واللفظ للمسلم۔ راوی : جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ۔

تالیفِ قلوب کے لیے زکوٰۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے تاکہ ایسے لوگوں کو کچھ دے دلا کر اُن کی مخالفت کا زور کم کیا جا سکے۔ فقہاء کے نزدیک دین کے غالب ہو جانے کے بعد یہ مد ختم ہو گئی ہے' لیکن اگر پھر کبھی اس قسم کی صورتحال درپیش ہو تو یہ مد پھر سے بحال ہو جائے گی۔

﴿وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ﴾ ''اور گردنوں کے چھڑانے میں' اور جن پر تاوان پڑا ہو (ان کے لیے)''

ایسا مقروض جو قرض کے بوجھ سے نکلنے کی مقدرت نہ رکھتا ہو یا ایسا شخص جس پر کوئی تاوان پڑ گیا ہو' ایسے لوگوں کی گلوخلاصی کے لیے زکوٰۃ کی رقم سے مدد کی جا سکتی ہے۔

﴿وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور اللہ کی راہ میں''

یعنی اللہ کی راہ میں جہاد میں اور دعوت و اقامتِ دین کی جدّوجہد میں بھی یہ رقم خرچ ہو سکتی ہے۔ لیکن زکوٰۃ اور صدقات کے سلسلے میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ پہلی ترجیح کے طور پر اولین مستحقین وہ غرباء' یتامیٰ' مساکین اور بیوائیں ہیں جو واقعی محتاج ہوں۔ البتہ اگر زکوٰۃ کی کچھ رقم ایسے لوگوں کی مدد کے بعد بچ جائے تو وہ دین کے دوسرے کاموں میں صرف کی جا سکتی ہے۔

﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶۰﴾ ''اور مسافروں (کی امداد) میں۔ یہ اللہ کی طرف سے معین ہو گیا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' حکمت والا ہے۔''

﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ کے الفاظ احکامِ وراثت کے سلسلے میں سورۃ النساء کی آیت ۱۱ میں بھی آئے ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے

مرزا قادیانی کا جہاد کو حرام قرار دینے کا

ابلیسی فیصلہ

اور مسلمانوں پر اس کے اثرات

انجینئر مختار فاروقی

دو صدی قبل برطانیہ مغلیہ سلطنت پر بے پناہ تشدد کے ذریعے قابض ہوگیا۔ اس عالمی صہیونی سامراج نے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ڈھایا تھا اس کے ردّعمل کو کم کرنے کے لیے ایک سیکولر نظامِ تعلیم جاری کیا اور ایک فرضی نبی (مرزا قادیانی) کھڑا کیا اور اس کے منہ سے اپنی پسند کی جو باتیں کہلوائیں اسے 'ابلیسی وحی' ہی کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک جہاد کا حرام قرار دینا تھا۔ آج ڈیڑھ صدی بعد مسلمانوں کی عظیم اکثریت عالمی صہیونی سامراج کے خلاف جہاد کے نام سے خائف ہے۔ ہم نے تحفظِ ختمِ نبوت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے عنوان سے تو بھرپور دفاع کیا مگر جھوٹی نبوت کی جھوٹی تعلیمات کے فروغ کے نتیجے میں اُمت کے جذبۂ جہاد کو ٹھنڈا پڑنے کے خلاف اپنی توانائیاں صرف نہیں کیں، جس کا نتیجہ ہے کہ آج امتِ مسلمہ کا معتدبہ حصہ عملاً جہاد سے کوسوں دور ہے۔

—— آیئے اس کی تفصیلات پر ذرا غور کرتے ہیں ——

ماضی میں جھانک کر دیکھیں —— اٹھارہویں صدی سے مغربی سامراج نے تجارت کی آڑ میں اسلحہ لاکر ہندو کے گٹھ جوڑ، اندرونی سازشوں اور میر جعفر (اور میر صادق) جیسے غداروں کی ایک کھیپ کو حکمران بنانے کے جھوٹے وعدے دے کر بنگال پر قبضہ کرلیا۔ یہ ۱۷۵۳ء کی بات ہے۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو شہید رحمہ اللہ کے بعد انگریز کو پورے ہند میں سیاسی سطح پر سینکڑوں میر جعفر اور میر صادق مل گئے اور اس طرح ۱۸۰۲ء میں انگریز کا عمل دخل تختِ دہلی پر بھی مستحکم ہوگیا۔ مغل بادشاہ برائے نام تھا، اصل حکمران انگریز تھا۔ ۱۸۳۵ء میں برطانوی سامراج

نے نظامِ تعلیم بدل دیا اور اس کے ساتھ قانون بدلنے کا آغاز کردیا۔ ظالمانہ قوانین اور مسلمانوں کو دبانے کے لیے بے رحم رویوں نے مسلمانوں کے کاروبار تباہ کردیے۔ ہندوؤں اور غیر مسلموں سے انگریز کوئی خطرہ نہیں محسوس کرتا تھا۔ اس نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور مسلمانوں کے اندر مذہبی جذبات اور خصوصاً جذبۂ جہاد —— انگریز کے لیے ڈراؤنا خواب تھا۔

اس خدشے نے ۱۸۵۷ء میں ایک حقیقت کا روپ دھارلیا۔ مسلمانوں کے سینوں میں آزادی کی تڑپ کی چنگاری بھڑک اُٹھی اور میرٹھ اور دہلی میں مسلمانوں نے سامراج کے خلاف بغاوت کردی۔ کچھ مقامات پر ہندوؤں نے ساتھ دیا اور قریب تھا کہ یہ جنگ —— حقیقتاً جنگِ آزادی بن جاتی —— مگر انگریز کے مظالم اور غداروں کے منافقانہ رویّوں نے انگریز کو برتری دے دی۔ مسلمان مجاہدین اور سرگرم کارکنان (activists) پس پردہ چلے گئے، مگر انگریز نے مستقبل کی پُرسکون حکومت کے لیے چار سال تک گشتی عدالتوں کے ذریعے غداروں کو استعمال کرکے چُن چُن کر سرگرم اور فعّال مسلمان نوجوانوں اور ان کی قیادت کو سرِعام پھانسیاں دیں اور بعض کو کالے پانی (جیسے موجودہ دور میں گوانتاناموبے جیل) کی سزا سنائی، جس سے انگریزی حکومت کی دہشت تو پھیل گئی، مگر جن کے اعزہ واقارب شہید ہوگئے ان کے سینوں میں انگریزوں کی نفرت نے جڑ پکڑلی۔ کئی فعال مسلمان حرمین شریفین ہجرت کرگئے۔

۱۸۵۷ تا ۱۸۶۰ء تک چار سالوں میں بیس سال سے اُوپر عمر کے تمام فعال مسلمان مجاہدین کو ختم کردیا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں انگریز نے قانون کی حکمرانی کا راستہ اختیار کیا اور جنوبی ایشیا براہِ راست برطانوی تخت کے تحت آگیا۔ صوبے، ضلع، تحصیل، تھانے اور عدالتیں بنیں۔ تمام قوانین ۱۸۶۰ء میں ہی بنائے گئے اور انگریزی گرفت مضبوط ہوگئی۔

۱۸۶۰ء تا ۱۹۰۰ء (بیس سال سے اُوپر عمر کے تمام فعال مسلم عناصر کو انگریز کی طرف سے سزائے موت ہوجانے کی وجہ سے) کوئی فعال مسلم قیادت سامنے نہ آسکی۔ تاہم انگریز کو ڈر تھا کہ مسلمانوں کا جذبہ جہاد ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی وقت بھی دوبارہ جاگ سکتا ہے۔ دوسری طرف انگریز جنوبی ایشیا میں ایک خاص منصوبہ بندی سے آیا تھا اور بالآخر اس کا رُخ عثمانی سلطنت کے نظامِ خلافت کی طرف تھا۔ یہ نظام مسلمانوں کی مرکزیت کا مظہر تھا اور یہ سلطنت ۱۹۰۰ء تک تین براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس برطانوی سامراج نے مسلمانوں کو سیاسی، عسکری اور تعلیمی طور پر بھی دبایا۔ لارڈ میکالے کا سیکولر، خدابیزار اور مذہب دشمن نظامِ تعلیم نافذ کردیا، پھر بھی

مسلمانوں کے اندرونی مذہبی نظام کی وجہ سے برطانوی سامراج کو سکون نہیں تھا۔

سرسیّد احمد خان کے ذریعے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ اس دوران میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے تھے' مگر مسلمانوں کی اکثریت انگریز سے نفرت کی وجہ سے انگریزی نظامِ تعلیم سے دور تھی۔

سامراجی اور صہیونی دماغوں نے اپنی ایک روایتی پرانی تدبیر آزمائی (جیسے عرب میں قرآنِ پاک میں ختم نبوت کے اعلان کے بعد یہودیوں نے جھوٹے نبی کھڑے کر دیے تھے) اور ایک 'خود کاشتہ' نبی کھڑا کر دیا (اس سکیم کی تفصیلات مذہبی میدان میں عام دستیاب ہیں اور خود اس جھوٹے نبی مرزا غلام احمد قادیانی سے متعلق تفصیلات شاہد عادل ہیں) اور اس کے ذریعے عوام کو دھوکا دینے کے لیے مذہب کی آڑ لے کر جھوٹے نبی کی جھوٹی وحی (جو اُسے انگریز نے dictate کرائی تھی) کے ذریعے جہاد کو حرام قرار دے دیا گیا۔

اس طرح انگریز کو قدرے اطمینان ہو گیا کہ اس کارروائی سے سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کا جو پروگرام وہ لے کر چل رہا تھا اس کے راستے میں مسلمانوں کی طرف سے متوقع مزاحمت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ بعد میں ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید رحمہ اللہ کو معزول کر کے ترکی میں آئینی خلافت کو رائج کیا اور بالآخر مصطفٰے کمال کے ذریعے ۱۹۲۴ء میں اس برائے نام خلافت کو بھی ختم کر دیا۔ سلطنت کے حصے بخرے کر دیے گئے۔ فلسطین یہودیوں کے حصے میں آ گیا اور مشرق وسطیٰ میں عثمانی سلطنت کے حصے کر کے آزاد مملکتوں اور ریاستوں کا درجہ دے دیا گیا۔

انگریز کو اُس وقت دھچکا لگا جب ترکی میں خلافت کے خاتمے پر سب سے زیادہ زوردار تحریک برطانوی ہند کے مسلمانوں نے چلائی اور برطانوی سامراج ڈولنے لگا۔ گاندھی جیسا ہندو بھی اس تحریک میں شامل ہو گیا (ورنہ کہاں ہندو کہاں خلافت کا مطالبہ!) کہ کہیں انگریز یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو حکومت دے کر ملک سے چلا نہ جائے۔

جہاد کے خلاف برطانوی سازشیں

ایک طرف —— برطانوی سامراج جھوٹے نبی کے ذریعے جہاد کے خاتمے کا اعلان کر کے عام مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کی اہمیت کو ختم کرنا چاہتا تھا اور یہ فکر پھیل رہا تھا۔

دوسری سمت —— مسلمانوں میں غلامی کی آہنی بیڑیوں کی وجہ سے بے عملی اور دین سے دوری تو تھی ہی' جہاد سے بھی بے رغبتی پیدا ہو گئی۔

تیسری سمت —— جو مسلمان جدید تعلیم کے حصول کے لیے سکولوں کالجوں اور بالآخر یونیورسٹیوں میں پہنچ جاتے ہیں' یہ نظامِ تعلیم بذاتِ خود سیکولر' بے دین اور خدا بیزار ہے' اس کے ذریعے انسان 'مذہب' ہی سے متنفر ہو جاتا ہے' جہاد تو کہیں بعد کی بات ہے۔

چوتھی سمت —— جو مسلمان گزشتہ ایک صدی میں یورپ' امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم یا حصولِ روزگار کے لیے چلے گئے ان کی اکثریت مغرب کے طرزِ بود و باش (life style) اور دنیا پرستی کی نذر ہو گئی اور 'ہر کہ درکانِ نمک رفت نمک شد' کی مثال بن گئی۔

پانچویں سمت —— آج میڈیا کے فروغ سے دور دراز علاقوں اور دیہاتوں میں بھی مغربی لباس' رہن سہن' آرام پرستی' جدید آسائشوں کا حصول ہی مطمحِ نظر بن گیا ہے۔ دین سے عملی بُعد تھا ہی' نصب العین کی تبدیلی اور ماحول کے بدل جانے سے ترجیحات بھی بدل گئیں اور ہمارے ہاں کے متوسط طبقہ کے اکثر لوگ بھی دینی ذمہ داریوں اور جہاد سے غافل ہو گئے ہیں۔

چھٹی سمت —— مغرب اور صہیونیت اپنے مقاصد کے حصول میں ہمہ وقت سرگرم اور منہمک ہے۔ اس نے مسلمان جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو دین سے ذہناً بیزار رکھنے اور غیر مسلم دنیا کو اسلام کی طرف کشش محسوس کرنے سے باز رکھنے کے لیے 'مولوی' اور دیگر اسلامی شعائر (داڑھی' پگڑی' مسلم لباس' سکارف' برقعہ وغیرہ) ہر چیز کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑ دیا ہے' جس سے آج عام آدمی کسی باعمل مسلمان کو دیکھ کر چوکنا ہو جاتا ہے اور اضطرابی اور پریشانی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان تمام سمتوں سے —— عالمی قوتوں اور صہیونیت کی ساری سرگرمیاں ایک مرکزی خیال پر مرتکز ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں کو جہاد نہیں کرنا چاہیے' جہاد تو دہشت گردی ہے' خودکش حملے دہشت گردی ہیں' مسلمان تو ہوتا ہی دہشت گرد ہے' لہٰذا جہاد سے ہمارا عام جدید تعلیم یافتہ مخلص مسلمان بھی آج متوحّش (allergic) ہو جاتا ہے۔

تحفّظِ ختمِ نبوت صرف نظریاتی سطح پر

گزشتہ ایک صدی میں مسلمانوں نے جھوٹے نبی کے اِبطال اور ختم نبوت کے تحفّظ کے لیے بے مثال کام کیا ہے اور پاکستان میں (کم از کم) ۱۹۷۴ء سے انہیں غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے (چند دیگر ممالک میں بھی اس کے بعد ایسے ہی قوانین بن گئے ہیں) مگر عملی زندگی

کے تمام شعبوں میں مذہبی گرفت کے کمزور پڑنے کی وجہ سے 'بے دینی' کا رنگ غالب آ جاتا رہا ہے اور آج کی ہر سطح پر جاری نظریاتی جنگ میں ایسے بے عمل مسلمان غیر جانبدار ہوتے جا رہے ہیں' جس سے مسلمانوں کی اجتماعیت کو ضعف و اضمحلال پہنچ رہا ہے اور 'اسلام کا جھنڈا' اُٹھانے والوں کی آواز مدھم ہوتی جا رہی ہے۔

قادیانی تعلیمات کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ذرا رُک کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آج ہم مسلمان اپنے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیں اور ٹھنڈے دل سے سوچیں تو صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ:

☆ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثر مساجد (۹۵ فیصد سے زیادہ) میں 'جہاد' کے موضوع پر خطاب نہیں ہوتا اور جہاد سے متعلق آیات زیر بحث نہیں آتیں۔

☆ ہمارے عام خطباء اور واعظین ہر چیز کو موضوعِ سخن بناتے ہیں سوائے جہاد کے۔

☆ ہماری دینی جماعتیں (اکثر) اپنے پروگرام میں جہاد کی اہمیت کو اجاگر نہیں کرتیں اور اس کے مراحل بیان نہیں کرتیں۔

☆ ہمارے دینی زعماء جہاد سے متعلق گفتگو کو بڑے نپے تُلے محتاط الفاظ میں بیان کرتے ہیں' کھل کر اور مثبت طور پر اسلام کے فروغ اور غلبہ کے لیے 'جہاد کی ضرورت' کا پرچار نہیں کرتے۔

☆ ہماری بعض مذہبی سرگرم جماعتیں —— عملی جہاد میں حصہ لینے والے (کشمیر' افغانستان' سوڈان' عراق وغیرہ میں) قلیل مسلمانوں کے لیے دعا بھی کرنا اپنے لیے 'گناہ' یا کم از کم شجرِ ممنوعہ سمجھتی ہیں۔

☆ ہمارے فقہی نظام میں قانونی طور ہی پر سہی جہاد 'فرضِ کفایہ' تو ہے —— ہمارے خانقاہی نظام میں جہاں ایمان بڑھانے کے لیے مجاہدات کرائے جاتے ہیں' یہ ایمان بنانے کی کوششیں آخر کس مقصد کے لیے ہیں؟ اسلام کے فروغ اور غلبہ کے لیے اور اس کے ضمن میں کھڑے ہو کر دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ہی ہیں نا! اس لیے کہ اس کی کوئی اور توجیہہ ممکن ہی نہیں۔ مگر افسوس کہ آج ہمارے تصوف کے تمام حلقے جہاد کے سلسلے میں 'مکمل خاموشی' کا منظر پیش کرتے ہیں اور پیرانِ طریقت ضربِ کلیمی اور 'یدِ بیضا' کی شان سے تہی دست ہیں۔

☆ مسلمان عوام چاہے بے عمل ہوں وہ نماز' روزہ' کلمہ' حج' زکوٰۃ کی اصطلاحات سے تو واقف ہوتے ہیں۔ پردہ' حلال و حرام سے بھی واقف ہیں —— مگر افسوس کہ ان کی زبان پر جو اصطلاح جاری نہیں ہوتی وہ جہاد کی ہے۔

☆ ہمارے معاشرے میں دین کے لیے کام کرنے کے لیے سنتوں پر عمل کا اہتمام کیا جاتا ہے (اور یقیناً یہ قابل ستائش ہے' ایسا کیا جانا چاہیے) دین کے لیے محنت پر زور دیا جاتا ہے۔ دین ہماری زندگیوں میں کیسے آئے گا' اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔ محنت کا لفظ عربی ہونے کے باوجود پورے قرآن مجید میں اس معنی میں نہیں آیا۔ علماء اور مفسّرین سے پوچھیں کہ دین کے لیے 'محنت' کے لفظ کے لیے قرآنی اصطلاح کیا ہے؟ تو سوائے اس کے کوئی جواب نہیں ہو سکتا کہ 'جہاد' —— اور اس سے بھی بڑھ کر 'جہاد فی سبیل اللہ'۔

اُوپر درج تفاصیل کا حاصل یہ ہے کہ آج تک جو ہماری ساری کوششیں تحفظِ ختمِ نبوت کے عنوان سے ہوئی ہیں اور اس کے قانونی پہلوؤں کی وضاحت میں ہماری توانائیاں اور مال صرف ہوا ہے' وہ بہت اہم ہے اور سب کے سامنے ہے۔ مگر نتیجہ یہ کہ —— جھوٹی نبوت کی جھوٹی وحی کا سکہ ایسا چلا ہے کہ ختم نبوت پر ایمان کا اعلان کرنے کے باوجود —— عملی زندگی میں مرزا قادیانی کی منحوس تعلیمات کا منحوس سایہ کسی نہ کسی صورت میں (ہماری انفرادی اور اجتماعی سطح پر) اثر انداز ہوتا نظر آتا ہے اور ہم جہاد سے ذہناً اور عملاً بہت دور ہیں۔ جبکہ دو صدی قبل جب انگریز کا غلبہ ہوا تو مسلمانوں نے تحریک جہاد شروع کی جو 'تحریک شہیدین' کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس تناظر میں ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اپنے نبی آخر الزمان ﷺ کے لائے ہوئے دین یعنی نظامِ خلافت کے نفاذ کے لیے جس اجتماعی جدّوجہد کی ضرورت ہے اس سے غافل نہ ہوں' اور علماء کرام کی رہنمائی و قیادت میں تحریکِ شہیدین کے دو سو سال بعد ہی سہی' اس خطہ میں (جہاں وہ جہاد ہوا تھا اور جو تحریکِ پاکستان کی بنیاد ہے) کھڑے ہو کر اسلام کے عادلانہ اجتماعی نظام (جو اخوت' حقیقی آزادی اور عدل پر مبنی ہے) کو نافذ کرنے کے لیے عملی جدوجہد کریں —— جس کا دوسرا نام جہاد ہے۔

علماء کرام جانتے ہیں کہ جہاد کے کئی مراحل ہیں:

(۱) ذاتی سطح پر —— جہاد مع النفس' جہاد مع الشیطان اور بگڑے ہوئے معاشرے کے

خلاف جہاد۔

(۲) معاشرہ کی سطح پر —— بے عملی کے خلاف جہاد، بے دینی کے خلاف جہاد، باطل فرقوں کے خلاف جہاد ہوگا اور یہ جہاد قلم، زبان، تحریر و تقریر اور مال سے بھی ہوگا۔

(۳) حکومتی اور سیاسی سطح پر —— یہ جہاد حکمرانوں کو غلط کاموں (خلافِ دین احکام اور فیصلوں) پر ٹوکنا، مثبت طور پر اسلام کے معاشی، معاشرتی نفاذ کے لیے پُرامن جدّوجہد اور تحریک چلانا اور ضرورت پڑے تو جو قوتیں اسلام کے عادلانہ نظام یعنی نظام خلافت کے نفاذ میں مزاحم ہوں اُن سے بالفعل جہاد کرنا بھی نظری طور پر جائز اور روا ہے۔

اُوپر درج ان حقائق کے پیش نظر آیئے ہم عہد کریں کہ ——

(۱) ہم مسلمان ہیں۔ حضرت محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں، آپ ﷺ کو آخری، کامل، مکمل نبی اور رسول مانتے ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد آنے والے ہر مدعی نبوت کو کافر، زندیق اور گمراہ سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیمات کو بھی کفر و ضلالت سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) ہم اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے فرمان کے مطابق 'جہاد' کو لازم سمجھتے ہیں اور جب تک دشمن سے جنگیں جاری ہیں جہاد کو بھی جاری سمجھتے ہیں۔ اس کو ترک کرنا مرزا قادیانی کے زیر اثر ہونے کے برابر سمجھتے ہیں۔

(۳) ہم اپنے دل میں دین کے لیے جدوجہد اور بالآخر کافروں سے میدانِ جنگ میں قتال کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں گے اور اللہ کے راستے میں نکلنے کی جتنی فضیلتیں ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ نے فرمائی ہیں ان کو خود بھی ازبر کریں گے، پھر اپنے گھر والوں کو یاد کرائیں گے، اپنی اولاد کو یاد کرائیں گے، اور یوں —— جھوٹے نبی کی جھوٹی تعلیمات کی عملاً مخالفت کرنے کو اپنی سعادت سمجھیں گے۔

(۴) ہم اپنی گفتگو میں اُٹھتے بیٹھتے 'جہاد فی سبیل اللہ' کی اصطلاحات کو کثرت سے رواج دیں گے اور باہمی گفتگو کا موضوع بنائیں گے۔

(۵) ہم اپنے دل میں شہادت کی آرزو پالیں گے اور اللہ کے دین کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کو آج کے بعد اپنی سعادت سمجھیں گے۔ یہی تعلیم اپنے گھر والوں اور اپنی اولاد کو دیں گے۔

(۶) مسواک، سُرمہ اور عمامہ کی طرح 'تلوار' کو بھی سنت سمجھتے ہوئے اس کو گھر میں رکھیں گے۔

اپنے بچوں کو پلاسٹک کی تلواروں جیسے کھلونے لے کر دیں گے۔ جدید جنگی ہتھیاروں جیسے کھلونے بھی لے کر دیں گے۔ (مگر جو فرق مسواک اور برش میں ہے وہی فرق تلوار اور کلاشنکوف کے کھلونے کے بارے میں ذہن میں رہے گا۔)

(۷) چونکہ جہاد اکیلے نہیں اجتماعی عمل ہے اس لیے کسی ایسی جماعت سے لازماً منسلک رہیں گے جو ہمارے نزدیک اسلام کے غلبے اور نظامِ خلافت کے قیام کے لیے کوشاں ہو اور اُس کے امیر کی اطاعت (معروف میں) کریں گے اور جان و مال کے ساتھ حاضر رہیں گے۔ اور اجتماعی طور پر جب جہاد کا اعلان ہوگا تو ہم پیچھے نہیں رہیں گے، بلکہ سچے مسلمانوں اور حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان لانے والوں کی طرح جہاد کی صفوں میں سب سے آگے ہوں گے۔

(۸) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ جہاد کا راستہ اور اس کے لیے جان و مال نثار کرنے کا ارادہ اس وقت تک ہمارے سینوں میں رہے گا جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

(۹) عملی جہاد کے اعلان سے پہلے اپنے ذہن میں جہاد کی تیاری کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات اور سیرۃ النبی ﷺ کی روشنی میں شہادت کی آرزو ہمارا نصب العین ہوگا۔ ؎

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کے ہاتھ پر یہ بیعت کی ہے کہ جب تک ہم زندہ ہیں ہمیشہ جہاد کرتے رہیں گے۔''

حاصل کلام یہ ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے حقیقی اور دیرپا تحفظ اور آپ ﷺ کی تعلیمات کے تحفظ کے لیے مسلمانوں میں عملی جہاد کا جذبہ اُجاگر کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک جھوٹی نبوت کی جھوٹی تعلیمات کو لغو قرار دینے کی عملی جدوجہد میں 'جہاد' (جیسے مثبت عمل میں اپنے آپ کو لگا دینے) جیسا کوئی اور عمل اتنا مؤثر نہیں ہوسکتا۔ جلسے، کانفرنسیں اپنی جگہ —— مگر امت میں اگر جذبہ جہاد کمزور ہو کر ختم ہوگیا تو تحفظِ ختمِ نبوت کی جدوجہد بھی دھیمی پڑ جائے گی اور ہم مسلمانانِ پاکستان قیامت کے دن آپ ﷺ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اعاذنا اللہ من ذٰلك!

❁❁❁

عظمتِ قرآن وصاحبِ قرآن ﷺ

اور دورِ حاضر میں اس کے تقاضے

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن حفظہ اللہ

مورخہ ۲۳/ جنوری ۲۰۱۱ء کو انجمن خدام القرآن سندھ کا سالانہ اجلاس منعقد کیا گیا' اس اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن صاحب' جو ملک کی معروف معتبر دینی شخصیت ہیں' کو مدعو کیا گیا۔ حضرت مفتی صاحب نے ادارے کی درخواست پر اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس اجلاس میں شرکت کی اور حاضرین کو اپنے پُرمغز خطاب سے نوازا۔ یہ خطاب کئی اعتبارات سے افادۂ عام کا حامل ہے' چنانچہ اسے کیسٹ سے اتار کر ماہنامہ میثاق کے صفحات کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ و دعا کے بعد:

انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی کے حسبِ مراتب تمام ذمہ داران کے تشکر کے بعد معزز خواتین و حضرات..... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

اس طرح کے اجتماعات میں آنا ہمارے لیے مشکلات کا باعث ہی ہوتا ہے۔ گزشتہ سال میں اسی طرح کے ایک اجتماع میں شریک ہوا' اُس میں مَیں نے چند کلمات کہے' اس حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں —— اور آج بھی یہاں آنے سے پہلے مجھے کئی ٹیلی فون موصول ہوئے کہ آپ فلاں جگہ جا رہے ہیں؟ میں نے کہا: ''جی ہاں' میں نے وعدہ کر لیا ہے''۔ دوسری جانب سے کہا گیا کہ آپ ان لوگوں کو جانتے ہیں؟ —— میں نے کہا: ''ہاں''۔ بعد ازاں میں نے ان سے عرض کیا کہ اس سے قطع نظر کہ میں کہاں جا رہا ہوں' آپ کو اِس سے غرض ہونی چاہیے' جو کچھ میں کہوں گا' اس کے بعد آپ کے جو تحفظات ہوں' اُن سے ضرور مجھے مطلع فرمایئے گا۔

گزشتہ اجتماع میں عنوان تھا ''شریعت: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟'' —— اس سیاق وسباق میں مَیں نے یہ کہا تھا کہ معاشرے میں صالح عناصر محدود تعداد میں ہوتے ہیں' اگر ان سب کا وزن عملی جدوجہد میں شامل نہ ہو' تو پھر خیر کی قوتیں کمزور رہتی ہیں اور شر کے خلاف اُن کی مزاحمت کی صلاحیت غیر مؤثر ہوتی ہے۔ سسٹم میں تو ہم پہلے ہی موجود نہیں ہیں' جہاں ہمارے ملک کے وہ تمام فیصلے ہوتے ہیں جو آئینی اور قانونی طور پر ہم پر بھی لاگو ہوتے ہیں' چاہے ہم ان کو پسند کریں یا ناپسند! میں نے عرض کیا تھا کہ ایک بڑی تعداد تبلیغی جماعت میں ہے اور ایک بڑی تعداد دعوتِ اسلامی میں ہے' لیکن وہ عافیت پسند لوگ ہیں' امر بالمعروف کرتے ہیں' اِس انداز سے کہ ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے!

یہ تبلیغ دین کا بے ضرر طریقہ ہے' اِس میں منکرات کی مزاحمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ لہٰذا اگر دین' عقیدے اور ملک وملت کے کسی مسئلے پر باہر نکل کر مزاحمت کی ضرورت پڑے' جو کہ اکثر پڑتی رہی ہے' تو اُس کا حصہ بننا اِن حضرات کی حکمت عملی کا حصہ نہیں ہے۔ کچھ مسائل تو بادیٔ النظر میں خالص سیاسی ہوتے ہیں' لیکن کچھ خالص دینی ہوتے ہیں' جیسے ناموسِ الوہیت' ناموسِ رسالت' ناموسِ قرآن' حرمت شعائر دین اور فحاشی وعریانی کا مسئلہ جو ایک سیلابِ بلاخیز کی طرح پورے معاشرے بالخصوص نوجوان نسل کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اِس دور کی سیاسی وسماجی اقدار کے مطابق منکرات کے آگے بند باندھنا عملاً ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

اس حوالے سے آخری فون مجھے یہ آیا کہ یُوٹیوب پر آپ کا جو پچھلا خطاب ہے' اس میں آپ نے کہا ہے کہ تبلیغی جماعت بھی غلط ہے اور دعوت اسلامی بھی غلط ہے۔ حالانکہ میری گفتگو میں ایسی کوئی بات نہیں تھی' صرف دعوتِ دین کی حامل اِن تنظیموں کو متوجہ کرنا مقصود تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کی دو ذمہ داریاں قرار دی ہیں' ایک ''امر بالمعروف'' اور دوسری ''نہی عن المنکر''۔ امر بالمعروف کا فریضہ تو آپ بجا لا رہے ہیں' لیکن نہی عن المنکر سے آپ لاتعلق ہیں۔ اسی کو دین کی کلیت اور جامعیت کہتے ہیں۔

گھر گھر جا کر ایک ایک فرد کو نماز کی تلقین کرنا بلاشبہ کارِ خیر ہے' اجرِ عظیم کا باعث ہے' سعادت مندی ہے' لیکن یہ کام دین کے داعی غیر مسلم ممالک میں بھی کر رہے ہیں اور وہاں بھی

اس کارِ خیر میں انہیں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں ہے۔ مگر اسلامی جمہوریہ پاکستان‘ جس کے حصول کے لیے بیش بہا قربانیاں دی گئیں‘ یہاں اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہاں پُرامن اور منظّم کاوش‘ عزم واستقلال اور مسلسل جہود ومساعی سے اِسلام کے غلبے اور اسلام کے اُن احکام کے نفاذ کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں جن کے لیے ایک ریاست اور ہیئتِ حاکمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مسلمان اور ہر دینی جماعت اس کے لیے مکلّف اور جوابدہ نہیں ہے؟

اِس پس منظر میں مجھے آج کی گفتگو میں کئی خطرات درپیش ہیں۔ آج کل یوٹیوب بھی آفت ہے‘ ایس ایم ایس بھی آفت ہے‘ ان کے علاوہ اور بھی کئی آفات ہیں۔ اس بار میں نے منع کیا‘ مگر بہت اصرار کے بعد میں نے ہامی بھرلی اور کہا کہ اپنی سوچ کے مطابق کچھ باتیں کروں گا‘ ہوسکتا ہے آپ کے ساتھیوں کو میری سب باتوں سے اتفاق نہ ہو۔ جتنا وقت دیا گیا ہے میں کوشش کروں گا کہ اس کی حدود میں رہتے ہوئے مقررہ وقت کے اندر اپنی بات مکمل کروں۔ اور پھر مجھے ایک دوسرے پروگرام میں جانا ہے‘ آپ کا پروگرام تو ماشاء اللہ جاری رہے گا۔

کلام اللہ کی اہمیت

جہاں تک عظمت قرآن کا تعلق ہے‘ ایک مسلمان کے لیے قرآن مجید کی عظمت کو بیان کرنے‘ تسلیم کرنے اور ماننے اور جاننے کے لیے اس سے زیادہ کسی دلیل اور حجتِ کاملہ بالغہ کی ضرورت نہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ عربی میں کہتے ہیں: ’’**كلام الملوك ملوك الكلام**‘‘ یعنی بادشاہوں کا کلام‘ کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ربِ کائنات کا کلام اس کی صفت ہے‘ اس کی شان ہے‘ تو مؤمن کے لیے‘ مسلم کے لیے اس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ باقی آیاتِ بینات اور دلائل قطعیہ ہم بہت بیان کرسکتے ہیں‘ لیکن ہمارے پاس وقت محدود ہے۔

کچھ لوگ قرآن مجید کی عظمت کے حوالے سے آج کل کے انسان کو عقلی اعتبار (common sense) سے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں‘ اِس کو ہم rationality یا rationalism سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی میں قرآن مجید کی بیشتر آیات اور سورتیں جو نازل ہوئیں‘ اُن میں وجودِ باری تعالیٰ‘ وحدانیت باری تعالیٰ اور حیاتِ بعدالممات کے عقلی دلائل بکثرت بیان کیے گئے ہیں۔

میں یہ بات نہایت شدت اور صراحت ووضاحت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ عصرِ حاضر

میں ہمارے لیے قرآن مجید سے وابستگی اور تمسّک اشد ضروری ہے۔ لیکن اس دور کے بعض متجدّد دانشور‘ جو قرآن ہی کے ساتھ تمسّک کا دعویٰ کرتے ہیں اور ائمہ دین اور علماء وصلحاءِ امت کی اجماعی راہ سے انحراف کرتے ہیں‘ اُن کی فکر سے جدید نسل کو بچانا اور دین کی صحیح آگہی دینا بھی علماءِ دین اور دینی جماعتوں کا فریضہ ہے۔

یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ جنرل پرویز مشرف جو ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۸ء تک پاکستان کے آمرِ مطلق بنے رہے‘ وہ اپنی سوچ کے مطابق دین میں تجدد‘ liberalism اور moderation کے داعی تھے اور مصطفیٰ کمال اتاترک ان کے ہیرو تھے۔ انہوں نے اپنے نظریات کے حامل مذہبی دانشوروں کو اسلامی نظریاتی کونسل پر بھی مسلّط کیا‘ حدود اللہ کے قانون کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالا اور ۲۰۰۶ء میں تحفظِ حقوقِ نسواں ایکٹ پارلیمنٹ سے پاس کرایا۔ اِن نظریات کے حامل دانشوروں کو بڑے پیمانے پر میڈیا پر رسائی دی گئی۔

اِن حضرات کی سوچ کا محور یہ ہے کہ:

(۱) اہانتِ الوہیت‘ اہانتِ قرآن اور اہانتِ رسالت پر سزا دینے کا قرآن میں کوئی قانون نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ قابلِ تعزیر اور قابلِ حد جرم نہیں ہے۔

(۲) اسی بنا پر یہ حضرات 295.C کو خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں۔

(۳) اِن کے نزدیک مسلمان عورت کے لیے اہلِ کتاب مرد سے شادی جائز ہے۔

(۴) تبدیلی مذہب یعنی مسلمان کا اسلام کو ترک کر کے مرتد ہوجانا‘ کوئی قابلِ تعزیر یا قابلِ حد جرم نہیں ہے۔

(۵) رفعِ عیسیٰ علیہ السلام کے بھی یہ حضرات قائل نہیں ہیں۔

(۶) بہت سے معجزات کے بھی قائل نہیں ہیں۔

اِن حضرات سے جب ٹیلی ویژن پر مکالمہ ہوا تو انہوں نے موقف اختیار کیا کہ قرآن میں اہانت رسول کی کوئی سزا نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اہانتِ رسول دین وشریعت میں قابل سزا جرم ہے اور دین قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے مجموعے کا نام ہے۔

اِن حضرات نے کہا کہ فقہاء نے اپنی فہم کے مطابق مرتد کی حد قتل مقرر کردی اور پھر اہانتِ رسول کے جرم کو بھی اس میں شامل کردیا۔ میں نے ناظرینِ کرام سے التجا کی آپ علامہ صاحب کی فکری اساس کو سمجھیں کہ اُن کے نزدیک پوری امت کے ائمہ وعلماء وفقہاء کی فہم ناقص ہے اور اِن حضرات کی فہم کامل ہے۔ تو اِن حضرات کے مطابق توہینِ رسالت پر سزا کا

قانون اُس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک قرآن میں اس طرح کے کلمات پر مشتمل کوئی آیت نہ ہو: ''مَنْ سَبَّ رَسُوْلًا فَاقْتُلُوْهُ وَمَنْ اَهَانَ رَسُوْلًا فَاقْتُلُوْهُ 'یعنی جو رسول (ﷺ) کو گالی دے یا اُن کی اہانت کرے اُسے قتل کردو''۔ اور چونکہ قرآن مجید میں اِن کلمات پر مشتمل کوئی آیت نہیں ہے' لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے والے کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ اس طرح عملاً اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قانونی صورتِ حال بھی وہی ہوجائے گی جو مغربی ممالک میں ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ قرآن صرف کلمات طیبات کا نام نہیں ہے' قرآن الفاظ اور معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اصولِ فقہ میں قرآن کی یہی تعریف درج ہے:

''کتاب اللہ اُس کلام کا نام ہے جو ختم المرسلین ﷺ پر نازل ہوا اور جو آپؐ سے تواتر اور قطعیت کے ساتھ آپ کے عہدِ مبارک سے اب تک نقل ہوتا آیا ہے' اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ لفظ ومعنی کے مجموعے کا نام ہے۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾﴾ (القیٰمة)

''(اے رسولِ مکرم ﷺ!) قرآن کو جلدی یاد کرنے کے شوق میں اپنی زبان کو جلدی حرکت نہ دیا کیجئے۔ اس کو (آپ کے دل ودماغ میں) جمع کرنا اور اسے (آپ کی زبان پر) جاری کرنا ہمارے ذمے ہے۔ پس جب ہم (یعنی ہمارا فرشتہ) پڑھ لیں' تو اُس کی متابعت میں اسے پڑھ لیا کیجیے۔ پھر اِس (قرآن) کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔''

دوسرے مقام پر سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾

''اور ہم نے آپؐ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ اُن احکام کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیں' جو اُن کی جانب نازل کیے گئے ہیں اور تاکہ وہ غور وفکر کریں۔''

کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ قرآن کے معانی ومطالب کو اُس عہد کے ادبِ جاہلی کی روشنی میں متعین کیا جائے۔ ایسا نہیں ہوسکتا! قرآن وحیٔ ربانی ہے اور اُس کے مطالب ومفاہیم کا مرکز بھی مہبطِ وحی' ذاتِ پاک محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔ صلوٰۃ' زکوٰۃ' صوم' حج اور دیگر قرآنی اصطلاحات کے معانی' مطالب' مصادیق اور اطلاقات رسول اللہ ﷺ ہی سے جانے جاسکتے ہیں۔

قرآن فہمی کا مستند ذریعہ سُنّت وحدیثِ رسول ﷺ ہے

قرآن مجید بعض اوقات خود اپنی تفسیر بیان کرتا ہے۔ ایک جگہ کوئی کلام مجمل ہے تو دوسری جگہ اُس کی تفسیر ہے' اسی طرح ایک جگہ مطلق ہے تو دوسری جگہ اُس کی قید کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے بعض امور کا بیان رسول اللہ ﷺ کے تواتر کے ساتھ تعامُل سے ملتا ہے۔ اُس کے بعد سنت وحدیث ہی قرآن کا مستند بیان ہیں۔ اس حوالے سے چند احادیث ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' وہ بیان کرتے ہیں:

كُنْتُ اَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ اَسْمَعُهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اُرِيْدُ حِفْظَهٗ ' فَنَهَتْنِي قُرَيْشٌ وَقَالُوْا اَتَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ تَسْمَعُهٗ؟ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَا ' فَاَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ ' فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَوْمَاَ بِاُصْبُعِهٖ اِلٰى فِيْهِ فَقَالَ: ((اُكْتُبْ! فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا حَقٌّ)) (سنن ابی داؤد' کتاب العلم' باب فی کتاب العلم)

''میں ہر وہ بات جو رسول اللہ ﷺ سے سنتا' لکھ لیا کرتا تھا۔ میں اسے یاد کرنا چاہتا تھا' تو قریش نے مجھے روک دیا اور کہا: کیا تم (رسول اللہ ﷺ سے) ہر سنی ہوئی بات لکھ لیتے ہو' حالانکہ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں' وہ (کبھی) غصے میں بات کرتے ہیں اور (کبھی) رِضا کی کیفیت میں' تو میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ پھر جب میں نے اِس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپؐ نے اپنی انگشتِ مبارک سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''(ہر بات) لکھ لیا کرو! اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' اِس منہ سے حق کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا۔''

(۲) حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلَا اِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ ' اَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ' فَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ ' اَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمْ لَحْمُ الْحِمَارِ الْاَهْلِيِّ وَلَا كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السَّبُعِ)) (سنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب فی لزوم السنة)

''سنو! مجھے قرآن عطا کیا گیا ہے اور اُس کی مثل (یعنی سنت وحدیث) بھی اُس کے ساتھ عطا کی گئی ہے۔ سنو! عنقریب ایک شخص شکم سیر (مستی کے عالم میں) اپنی مسند پر

بیٹھا ہوگا اور کہے گا: ''اس قرآن کو لازم پکڑو' سو جس چیز کو تم اس میں حلال پاؤ تو اسے حلال جانو اور جس چیز کو اس میں حرام پاؤ تو حرام جانو۔ سنو! تمہارے لیے پالتو گدھے کا گوشت حلال نہیں ہے' نہ ہی کچلیوں سے شکار کرنے والے درندے حلال ہیں۔''

پس اس حدیث پاک کی رو سے شیر' چیتا' بھیڑیا' کتا' بلی اور تمام درندے حرام ہیں' اور اِن کی حرمت قرآن میں بیان نہیں ہوئی' بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی اتھارٹی سے حدیث میں بیان فرمائی ہے۔ معلوم ہوا کہ حلت وحرمت کی حدیں قرآن پر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ ان کو صاحبِ قرآن سے بھی جاننا پڑے گا اس لیے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ یہ فرما رہے تھے کہ حلال قرار دینے کی اتھارٹی میرے پاس ہے' حرام قرار دینے کی اتھارٹی میرے پاس ہے' تو یہ اتھارٹی آپ قرآن ہی سے اَخذ کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف)

''(اور وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اُس رسول کی جو نبی اُمی ہے جس (کے ذِکر) کو وہ (پہلے سے) اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں' وہ (رسول) انہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں' وہ اُن کے لیے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں' ان سے (ماضی کی بدعقیدگیوں اور فاسد اعمال کے) بوجھ اُتارتے ہیں اور (جہالتوں کے) طوق جو اُن کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں' اُن سے انہیں نجات دیتے ہیں۔ پس وہ لوگ جو اُن پر ایمان لائے اور اُن کی تعظیم کی اور اُن کی نصرت کی اور اُس نور (قرآن) کی پیروی کی جو اُن کے ساتھ اتارا گیا' وہی (درحقیقت) فلاح پانے والے ہیں۔''

پس اس نبی ﷺ کی شان یہ ہے کہ پاک چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ قرآن نے بھی بتلایا کہ تحلیل اور تحریم یعنی چیزوں کو حلال یا حرام قرار دینے کی اتھارٹی اللہ تعالیٰ کے علاوہ اللہ کے رسول کے پاس بھی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

بااختیار مجاز مقنّن اور شارع (authorized law giver) ہیں' یعنی قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تحلیل (legalization) اور تحریم (prohibition) کا اختیار رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا ہے۔ یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حلت وحرمت کی اتھارٹی نہیں ہے۔ یہ تفصیل میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ہمارے آج کے متجددین شراب کو بھی دمِ مسفوح' خنزیر اور غیر اللہ کے نام پر مذبوحہ حلال جانور کے درجے میں حرامِ قطعی تسلیم نہیں کرتے' کیونکہ یہاں پر صیغۂ حرمت کے ساتھ خمر کا ذکر نہیں ہے:

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ (البقرہ:۱۷۳)

''اُس نے حرام کیا ہے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔''

لہٰذا ان کے نزدیک اس طرح سے شراب حرامِ قطعی نہیں ہے۔ حالانکہ کئی طریقوں سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی حرمت کو بیان کیا ہے' اس کا وقت نہیں ہے کہ میں تفصیلات بیان کرسکوں۔ اس لیے اُمت کو آج اس بات کو جاننے' سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ آج ہم ایک مشکل دور میں ہیں۔

جب ہمارا اِن حضرات سے میڈیا پر مکالمہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے مطالعہ کے مطابق قرآن میں گستاخِ رسول کی سزا نہیں ہے۔ فقہاء نے اپنے فہم کے مطابق ارتداد کو واجب القتل جرم قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ انہوں نے اہانت رسول کو نتھی کر دیا ہے۔ جب اینکر میری طرف آیا' چونکہ میڈیا پر ہم لوگ تو ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں ہوتے' تو میں نے جواباً عرض کیا: علامہ صاحب کا موقف آپ نے سمجھا' وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تمام فقہاءِ اُمت' تمام مسالک کے فقہاء جو اس ملک میں پائے جاتے ہیں' آپس کے اختلاف کے باوجود وہ حنفیہ ہوں' شافعیہ ہوں' مالکیہ ہوں' حنبلیہ ہوں' سلفیہ ہوں یا فقہ جعفریہ کے ماننے والے ہوں یا پاکستان کے تناظر میں اہلِ سنت ہوں' جن کو عرف عام میں بریلوی کہتے ہیں' دیوبندی ہوں' اہلِ حدیث ہوں' اہلِ تشیع ہوں یہ اور اُمت کے تمام مسلمہ فقہاء' وہ کہتے ہیں کہ گستاخِ رسول واجب القتل ہے' لیکن علامہ صاحب فرما رہے ہیں کہ اِن سب کا فہم ناقص ہے۔ میرا فہم کامل یہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ پوری اُمت کو چیلنج کر رہے ہیں۔ لہٰذا جب وزیر قانون کا بیان آیا

کہ سلمان تاثیر کے قتل کا محرّک (motive) سیاسی ہے تو میں نے کہا کہ اگر political motive ہے تو پھر اس کی ذمہ داری صدر پاکستان اور وزیراعظم پاکستان پر عائد ہونی چاہیے‘ کیونکہ ایک ایسے شخص کو انہوں نے آئینی عہدے پر نامزد کیا جس نے آئین کی پاسداری کا حلف اٹھایا اور وہ آئین کے تقاضوں کو برسرعام پامال کرتا رہا۔ اس کی رو سے اسے ملکی قانون اور عدلیہ کا محافظ ہونا چاہیے تھا‘ لیکن وہ عدالت اور قانونِ رسالت کی توہین کرتا رہا‘ اسے کالا قانون کہتا رہا اور یہ سب کچھ سرعام ہو رہا تھا۔ صدر مملکت کا کام تھا روکنا‘ وزیراعظم کا کام تھا ٹوکنا‘ لیکن ان دونوں نے سمجھا کہ شریف برادران کی ناموس اور رسالت مآب ﷺ کی ناموس ایک ہی چیز ہے‘ اِس سے کھیلو یا اُس سے کھیلو‘ کیا فرق پڑتا ہے! تو اس کا انجام کبھی ناخوش گوار بھی ہوتا ہے۔ اس لیے میں میڈیا کے دوستوں سے بھی بارہا کہتا ہوں کہ یا تو آپ کہیں کہ آپ کا کوئی خاص ایجنڈا ہے‘ یا آپ مذہبی مصلح (religious reformer) بن کر آ گئے ہیں کہ ایک خاص تصورِ مذہب آپ نے سترہ اٹھارہ کروڑ مسلمانوں پر مسلط کرنا ہے۔ دیگر لوگ آپ کے نزدیک جنونی (fanatics) ہیں‘ تو پھر ان سترہ اٹھارہ کروڑ مسلمانوں پر رحم کرو‘ ان پر کرم کرو‘ اور ان کے عقائد کو مجروح نہ کرو۔ اگر مجروح کرو گے تو پھر کبھی کبھی کسی کے ضبط کا بندھن ٹوٹ بھی سکتا ہے۔

اگر میں یہ کہتا ہوں کہ تمام دیندار طبقوں کو دین کے لیے میدانِ عمل میں آنا چاہیے تو آپ کے ملک کی تاریخ کیا یہ نہیں ہے کہ اٹھارہ گھنٹے تک وکلاء نے سڑکوں پر کھڑے ہو کر جلوس نکالا‘ اسلام آباد گئے‘ پُرامن طور پر منتشر ہو گئے‘ حالانکہ اٹھارہ گھنٹے آج کل کوئی باپ کے جنازے کے ساتھ بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ تو اُس کا مذاق اڑایا گیا کہ اعتزاز نے یہ کر دیا‘ فلاں نے فلاں پ کر دیا‘ فلاں نے یوں کر دیا‘ فلاں نے یہ کر دیا‘ چینل کے دوست بھی دفتر کھول کر بیٹھ گئے‘ لیکن اگلے سال جب یہ لگا کہ اَب اسلام آباد محصور ہو رہا ہے‘ تو آدھی رات کو مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس لیے مسلمانوں کے پاس دو راستے ہیں‘ یا تو نظام کے اندر آپ کے پاس اتنی طاقت ہو کہ جہاں پر قانون بننا ہے‘ جہاں پر قانون رد ہونا ہے وہاں ہماری غالب اکثریت ہے تو ہم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر جب تک باہر آ کر یہ پیغام نہیں دیں گے کہ اگر آپ نے اسلام کو چھیڑا تو آپ کا اقتدار بھی باقی نہیں رہے گا تب تک وہ مانیں گے نہیں!

قرآن کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے متحرّک ہونے کی ضرورت

اگر اقتدار اور دین کا ٹکراؤ ہو جائے‘ جیسے آپ کو یاد ہو گا حدود آرڈی نینس کا مسئلہ پیش آیا تھا‘ چوہدری برادران کی انتہائی کوشش تھی کہ مصالحت ہو جائے‘ یہاں تک کہ مجھے اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کو چوہدری پرویز الٰہی دو مرتبہ اپنے جہاز پر یہاں سے لے کر گئے۔ وہاں رات رات بھر مکالمہ ہوتا رہا‘ معاہدہ لکھا گیا‘ اُس پر ان کے اور ہمارے دستخط ہوئے‘ انہوں نے کہا کہ ہم اس پر قائم رہیں گے۔ لیکن جب وقت ایسا آ گیا کہ یا آپ کرسی کو بچا لیں یا اپنے دین اور ایمان کو بچا لیں؟ تو اُس وقت چوہدری صاحب دین کے ساتھ نہ کھڑے ہو سکے۔ آج ہمارے ملک کی جو قانونی صورت حال ہے وہ یہ ہے کہ پردے کے پیچھے ’’زنا بالرضاء‘‘ کوئی جرم ہی نہیں‘ جیسا یورپ اور امریکہ میں ہے۔ کمرہ بند کر کے اجنبی لڑکا لڑکی‘ مرد و عورت جو مرضی کریں‘ قانون ان کو چھو نہیں سکتا‘ ان کے قریب نہیں آ سکتا‘ ان کو ٹچ نہیں کر سکتا۔ یہی یورپ میں ہے‘ یہی امریکہ میں ہے۔ لیکن کوئی سوچے کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ کوئی ایسا کرے تو اُس کے دل پر کیا گزرے گی‘ تو کیا قوم کی بیٹیاں ہماری بیٹیاں نہیں ہیں؟ کیا قوم کی بہنیں ہماری بہنیں نہیں ہیں؟ کیا ان کے ناموس کو بچانا ہماری ذمہ داری نہیں ہے؟ کوئی اس کے لیے اعداد و شمار جمع کرے کہ جب قانون کا راستہ بند کر دیا جائے تو پھر ماورائے عدالت کتنے قتل ہوتے ہیں؟ اس مسئلہ پر پاکستان میں جتنے بھی جرم ہو رہے ہیں اِن سب کا خون پرویز مشرف کی گردن پر ہے‘ اُس پارلیمنٹ کی گردن پر ہے جس نے اسے پاس کیا‘ اِن سب کا خون ان لوگوں کی گردن پر ہے جنہوں نے اس کو پروموٹ کیا۔ اسی طرح ان لوگوں کی گردن پر ہے جو اُس کے خلاف اُس وقت طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے۔ جب نہیں آئے تو حدودِ الٰہی کو توڑ دیا گیا۔ اب آپ اپنی صفائی جیسے مرضی پیش کرتے رہیں‘ سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ یہ آپ کے سامنے پاکستان کی تاریخ ہے۔ پاکستان کی قانونی پوزیشن آج وہی ہے جو مغرب کی ہے۔ ہمارے ہاں اسلامی نظریاتی کونسل پر تو پرویز مشرف کے نظریات کے حاملین کی اجارہ داری ہے۔ آخری سفارش ان کی یہ تھی کہ اگر بیوی شوہر سے مطالبہ کرے کہ مجھے طلاق دے دو اور ۹۰ دن میں شوہر جواب نہ دے تو اس کو automatic ally طلاق ہو جائے گی۔ یہ امریکہ میں بھی نہیں ہے‘ یورپ میں بھی نہیں ہے‘ یہ روئے زمین پر کہیں بھی نہیں ہے جو وہ کرنے جا رہے تھے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ڈیانا اور پرنس چارلس کا جو مسئلہ ہوا تھا کہ ایک سال تک اُن میں

علیحدگی (separation) کی گئی اور جب اس عرصے میں مفاہمت (reconciliation) نہ ہوسکی تو طلاق کی توثیق (confirmation) کر دی گئی۔ جس کو تکلیف ہوگی وہ عدالت میں جائے گا' عدالت دوسرے فریق کو بلائے گی' عدالت پہلے separation کرے گی اور ایک سال مفاہمت (reconciliation) کا ٹائم دے گی۔ اور اگر ایک سال کے دوران مفاہمت نہ ہوسکی تو پھر طلاق کی توثیق (confirm) ہوگی —— اور یہ ہمارے ہاں automatic نظام رائج کرنے جا رہے تھے۔ اگر وہ ہو جاتا تو شاید کتنے ہی خاندان فارغ ہو چکے ہوتے۔ چنانچہ جن کو قرآن سے عشق ہے' جن کو قرآن سے محبت ہے' تو پھر قرآن کے لیے' قرآن کی تعلیمات کو بچانے کے لیے میدان میں آئیں۔ یہ نہیں کہ ہم صرف تلاوت پر اکتفا کریں' تفسیریں بیان کریں' درس کی مجالس منعقد کریں۔ قوم کو پڑھا رہے ہیں' کتنوں کو پڑھا لیں گے؟ جب تک آپ عوام (masses) کو ساتھ نہیں لیں گے' کام نہیں بنے گا۔

قرآن کو زندہ رکھنا ہے' تابندہ رکھنا ہے تو پھر قرآن کے لیے اِس اُمت کو متحرک بھی رہنا ہوگا اور پھر ہر ایک کو باہر نکلنا بھی ہوگا۔ جب اس کے سوا تمام معقولیت کے راستے بند کر دیے جائیں اور ۱۸ کروڑ مسلمانوں کی بات کو کوئی سننے کے لیے تیار نہ ہو اور جہاں قانون بننا ہے وہاں بھی آپ موجود نہ ہوں تو پھر کون سا راستہ رہ جاتا ہے؟

قرآن اور صاحبِ قرآن کی عظمت کو میدان میں آ کر منوانا ہوگا

میں میڈیا کے دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں' کہ religious reformer بننا چھوڑ دیں اور news channel رپورٹنگ کریں' خبریں دیں اور یہ سب کام کریں۔ اس ملک میں کافی امور اصلاح طلب ہیں۔ کیا باقی سب شعبوں کی اصلاح ہوگئی ہے کہ سب مذہب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں' یعنی سب اس نقطے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور اس پر تبصرے کر رہے ہیں۔ اس کے لیے اگر کسی کو قرآن سے محبت ہے تو قرآن اور صاحب قرآن کے ناموس کے لیے جاگتے رہنا ہوگا اور میدانِ عمل میں آنا ہوگا۔ صرف درس کی مجالس سے یہ ہوتا تو اسلام میں حدود لازم نہ ہوتیں۔ آپ کی جتنی مجالسِ درس منعقد ہوتی ہیں انہیں سو یا ہزار سے ضرب دے دیں پھر بھی تبدیلی نہیں آسکتی۔ میں نے ایک موقع پر مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے کہا تھا کہ جب چار' پانچ ثقہ' جید اور مستند پارلیمنٹ میں تھے تو اُس وقت ۱۹۷۳ء کا اسلامی آئین بنا' جب چند افراد تھے تو قادیانیت کے ارتداد کی ساتویں آئینی ترمیم منظور ہوئی اور جب ۲۰۰۲ء کی اسمبلی میں

مذہبی جماعتوں (متحدہ مجلس عمل) کے اسمبلی ممبران تقریباً سو کے قریب تھے' تو ۲۰۰۶ء میں حدودِ الٰہی کو پامال کیا گیا!!! اس لیے میں کہتا ہوں کہ معیار (quality) کی بات ہوتی ہے' صرف مقدار (quantity) کافی نہیں ہوتی۔ اس لیے قرآن کی عظمت کے قصیدے پڑھنے سے کام نہیں چلے گا' قرآن کی عظمت اور صاحب قرآن کی عظمت کو میدان میں آ کر منوانے سے اور قائم رکھنے سے کام چلے گا۔ ہم آج کل صرف تعریف کرتے ہیں۔ اس کی تو مثال ایسی ہے کہ ایک شخص بستر مرگ پر ہو' اور ایک نسخہ شفا اور اکسیر دوا اس کے پاس ہو' یا اس کے سرہانے آبِ حیات رکھا ہو' مریض بھی اس کی تعریف کرے اور اس کے تیماردار بھی اس کی تعریف کریں کہ ماشاء اللہ کیا نسخہ ہے! تو بتایئے کہ جب تک مریض اس کے کڑوے گھونٹ کو حلق سے نہیں اتارے گا محض دوا کی تعریف کرنے سے اس کو شفا ملے گی؟ ہم زیادہ وقت اس کی تعریف پر گزار رہے ہیں۔ اصل کام اب اس کو اندر اتارنا ہے' وجود میں اتارنا ہے' اور اپنے وجود میں' اپنی روح میں' اپنے قلب میں' اپنے ذہن میں جذب کر کے عمل کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اور پھر ناموسِ قرآن کے لیے' ناموسِ دین کے لیے' ناموسِ رسالتؐ کے لیے میدانِ عمل میں ہر وقت سربکف رہنا ہے۔ اگر ہم خلوت میں بیٹھ کر عظمت کو عملاً قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ کام لازماً کرنا ہوگا اور اگر ہم عظمت کے قصیدے پڑھنے پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں:

ع ''ہیچ آفت نہ رسد گوشہ تنہائی را''۔ پس گوشہ تنہائی میں آپ جو مرضی کرتے رہیں' آپ کو آپ کے راحت کدے میں آ کر کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ ایک لاکھ مجالسِ درس قائم کر دیں' آپ بند کمرے میں بڑے بڑے اجتماعات منعقد کر دیں' لیکن اگر آپ کے پاس باطل کو ختم کرنے کی طاقت نہیں ہے' اس کے آگے سدِ راہ بننے اور مزاحمت کی آپ کے پاس قوت نہیں ہے' تو پھر قصائد پر اکتفا کرنا پڑے گا' اور اگر طاقت ہے تو پھر تنفیذ اور اس کے ثمرات آپ کو نظر آئیں گے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

نوٹ: تقریر اور خطابت کا اپنا انداز ہوتا ہے اور تحریر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ تقریر اور تحریر میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے ترتیب و تسوید کی ضرورت کے تحت جملوں کو مربوط کیا گیا ہے۔

صدق و سچائی

اَخلاقی خوبیوں کی اصل بنیاد

عتیق الرحمٰن صدیقی

اخلاقِ حسنہ کے اجزاء اتنی خاصی تعداد میں ہیں کہ ان کا احاطہ آسان نہیں' مگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخلاق کی ایک قسم اساسی اور بنیادی نوعیت کی ہے اور دوسری فروعی۔ اخلاق کے جوہری ارکان وہ ہیں جو ثانی الذکر کا مرجع ومصدر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو فطری قوتیں ودیعت فرمائی ہیں ان میں اعتدال فضائل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور عدمِ اعتدال سے رذائل نمو پاتے ہیں —— اسلام میں اصل مقصود اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے۔ جن کاموں کو اللہ پسند فرماتا ہے وہ اچھے ہیں اور جنہیں وہ ناپسند کرتا ہے وہ برے ہیں۔ اچھے اور برے امور کا تعین قرآن حکیم نے جا بجا فرما دیا ہے۔ بندگانِ خدا کے اوصاف کیا ہیں' ان کی تصریح بھی متعدد مقامات پر ہے اور ناپسندیدہ بندوں کے خدوخال کیا ہیں' ان کی تعیین بھی اللہ وحدہٗ لاشریک نے کر دی ہے۔ فوز وفلاح بھی انہی لوگوں کا مقدر ہے جو اوصافِ حسنہ سے متصف رہیں' جبکہ اوصافِ سیئہ سے آلودہ رہنے والوں کا انجام عبرتناک ہوتا ہے۔

اگر اخلاقی خوبیوں کا مدارج کے اعتبار سے تعین کیا جائے تو منزلت ومرتبت کے لحاظ سے صدق وسچائی کو اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔ قول وعمل کی صحت ودرستی کی بنیاد ہی یہ ہے کہ دل اور زبان میں ہم آہنگی ومطابقت ہو۔ لغوی اعتبار سے صدق کے معنی ہیں دل وزبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفسِ واقعہ کے مطابق ہونا۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں وہ بات یا تو کلام کے صدق کے ساتھ متّصف ہی نہیں ہوگی یا دو مختلف حیثیتوں سے کبھی صدق اور کبھی کذب کے ساتھ متصف ہوگی۔ مثلاً ایک کافر جب اپنے ضمیر کے خلاف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کہتا ہے تو اسے نفس واقعہ کے مطابق ہونے کی حیثیت سے صدق (سچ) بھی کہہ سکتے ہیں اور دل وزبان کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے کذب

(جھوٹ) بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس دوسری حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کو ان کے اقرار ﴿نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (المنٰفقون:۱) ''ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں'' میں جھوٹا قرار دیا ہے' کیونکہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ بات کہہ رہے تھے۔ مختصراً صدق' کذب کا متخالف اور متقابل لفظ ہے اور بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتا ہے' خواہ اس کا تعلق زمانۂ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے' وعدہ کی قبیل سے ہو یا وعدہ کی قبیل سے نہ ہو۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: مفردات القرآن)

حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی تعلیمات میں اخلاقِ حسنہ پر خاصا زور دیا ہے اور انہیں لازمۂ ایمان واسلام قرار دیا ہے۔ ان میں سچائی اور امانت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جھوٹ بولنا نفاق کی علامات میں سے ہے۔ مؤمن کے بارے میں تو فرمایا گیا کہ وہ جھوٹ بولنے کا عادی نہیں ہوسکتا۔ نبی مکرم ﷺ نے متعدد مواقع پر سچائی اور امانت پر قائم رہنے اور جھوٹ اور خیانت سے پرہیز کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ' فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِىْ اِلَى الْبِرِّ' وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ' وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا' وَاِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ' وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا)) (صحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله)

''سچائی کو اختیار کرو' کیونکہ سچائی نیکی (اور اللہ تعالیٰ کی وفاداری) کی راہ پر لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ پر کاربند رہتا ہے' حتیٰ کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ لیا جاتا ہے —— اور تم جھوٹ سے بچتے رہو' کیونکہ جھوٹ نافرمانی کی راہ پر لے جاتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ پر کاربند رہتا ہے' یہاں تک کہ اللہ کے ہاں کذّاب لکھ دیا جاتا ہے۔''

صدق اور سچائی اخلاقی خوبیوں کی اصل بنیاد اس لیے ہے کہ زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو آب وتاب عطا کرنے میں اس کا کردار متاثر کن ہوتا ہے۔ یہ وصف اسے نفاق کے مرض

میں مبتلا نہیں ہونے دیتا' ایفائے عہد اُس آدمی کی خاصیت بن جاتی ہے' ملمع کاری اور فریب کاری سے وہ محفوظ رہتا ہے' حق گوئی و بے باکی اس کا آئین بن جاتا ہے' خوشامد پر وہ نفرین بھیجتا ہے' اس کی راست بازی اور راست گوئی کی بدولت ہر کوئی اس پر اعتماد کرتا ہے' فسق و فجور کا میلان اسے اپنے چنگل میں پھانسنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کے کردار کی یہ شفافیت اس کی امتیازی شان کی آئینہ دار ہوتی ہے اور یہ صداقت شعاری اسے مقامِ صدیقیت پر فائز کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جا بجا اپنی صفات گنوائی ہیں اور ان میں سے صدق کی صفت کو اپنی ایک نہایت اہم صفت قرار دیا ہے۔ قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾﴾

''اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہو سکتی ہے!''

اسی سورہ میں دوسرے مقام پر' ان اہل ایمان کو جو نیک عمل کریں گے' جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾﴾

''اور وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں تو انہیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا!''

قرآن کریم اور نبی مکرم ﷺ کی تعلیمات پر جب یہود کوئی اصولی اعتراض نہ کر سکے اور فقہی موشگافیوں کا سہارا لینے لگے' تو انہیں بتایا گیا کہ دین کی اساس تو اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی ہے۔ تم نے بندگیٔ رب سے منہ موڑ لیا ہے اور شرک کی آلائشوں میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہو' اگر تم اپنے موقف میں سچے ہو تو تورات کی کوئی عبارت پیش کرو۔ پھر فرمایا:

﴿فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۟ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾﴾

(آل عمران)

''پس جو لوگ اس کے بعد اپنی جھوٹی (گھڑی ہوئی) باتوں کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے' پس تم یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرو۔ اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔''

یعنی ان پر واضح کر دیا گیا کہ اللہ سچا ہے اور اس کی ساری شریعت سچی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً جو انبیاء مبعوث فرمائے وہ حق و راستی کا اعلیٰ اور کامل نمونہ تھے۔ ان کی صداقت ہر شائبہ سے پاک تھی۔ ان نفوسِ قدسیہ کی جلالت شان کا اقتضا بھی یہ تھا کہ وہ اللہ کا پیغام پوری امانت کے ساتھ انسانوں تک پہنچائیں۔ وحی لانے والے فرشتے کو روح القدس کا لقب عطا فرما کر اس حقیقت کو واشگاف کیا گیا کہ کلام پاک کو ایسی روح لے کر آتی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ سراسر ایک مقدس اور مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ پہنچاتی ہے — انبیاء کرام علیہم السلام کی بھی ساری باتیں سچائی سے مملو ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد پیغمبروں کو اس صفت خاص سے متصف کیا ہے۔ ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾﴾ (مریم) ''اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو۔ بے شک وہ ایک راست باز (انسان اور) نبی تھے''۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾﴾ (مریم) ''اور اس کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کے سچے اور رسول نبی تھے''۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾﴾ (مریم) ''اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کرو' وہ ایک راست باز (انسان اور) نبی تھے''۔ حضرت مریم علیہا السلام جنہوں نے اللہ کی باتوں کو سچ ماننے میں ذرا بھی تامل نہ کیا' انہیں صدق کے وصف سے مشرف کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ﴾ (المائدۃ:۷۵) ''اور ان (عیسیٰ علیہ السلام) کی ماں بڑی سچی تھی''۔ حضرت یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے کہ لوگوں نے ان کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کی: ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ﴾ (یوسف:۴۶) ''یوسف! اے بڑے سچے!''

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۵)

''جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں (ان کی رفیق ہوں گی) اور اللہ کی رضا (سے وہ سرفراز ہوں گے)۔''

ان بندوں کی اللہ تعالیٰ نے جو صفات بیان کی ہیں ان میں ایک اہم صفت ان کا راست باز ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مغفرت کا وعدہ فرمایا اور اجرِ عظیم سے نوازے جانے کی بشارت دی ان میں اسلام و ایمان اور اللہ کی فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ ..... اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾﴾

''بالیقین جو مرد اور عورتیں مسلم ہیں، مؤمن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں..... اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔''

جو لوگ صدق و سچائی کے عَلَم بردار رہیں گے اور سچائی ہی ان کی زندگی کا اثاثہ رہے گی تو وہ آخرت کے روز ان کی کامیابی و کامرانی کا وسیلہ بنے گی۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ﴾ (آیت ۱۱۹)

''یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا صدق کام آئے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے سچوں کی صحبت اختیار کرنے، سچوں کے ساتھ رہنے اور ان کا ساتھ دینے کا حکم صادر فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾﴾ (التوبۃ)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔''

اسلام کی نگاہ میں سچائی کے معنوں میں خاصی وسعت پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے صرف قول کی سچائی مراد نہیں بلکہ عمل کی سچائی بھی اس میں داخل ہے۔ امام غزالیؒ نے ''احیاء العلوم'' میں اس کی چھ قسمیں بیان کی ہیں، جبکہ سید سلیمان ندویؒ نے ان سب کو تین قسموں میں محیط کیا ہے، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی (ملاحظہ ہو سیرت النبی ﷺ،

جلد ششم)۔ زبان کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو صداقت کے منافی ہو۔ یہ سچائی کی ایسی قسم ہے جس کی پابندی لازمۂ ایمان ہے۔ اس کے مقابلے میں ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا:

﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ.....﴾ (آیت ۲۴)

''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے.....''

گویا صدق، ایمان کا اور جھوٹ، نفاق کا سرمایہ ہے۔ اس حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے مختلف پیرایوں میں ظاہر کیا ہے۔ حضرت امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: أَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ)) فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ)) فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا؟ فَقَالَ: ((لَا!)) (موطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء فى الصدق والكذب)

''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مؤمن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں''۔ پھر پوچھا گیا: کیا مؤمن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں''۔ پھر سوال کیا گیا: کیا مؤمن جھوٹا ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں!''

ایک دوسری حدیث میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) وفى روايةٍ لمُسلِمٍ: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ)) (صحيح البخارى، كتاب الايمان، باب علامة المنافق۔ وصحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان خصال المنافق)

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: (i) جب بولے جھوٹ بولے (ii) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے (iii) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔'' مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں، اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔''

صدق کی دوسری قسم کا تعلق دل سے ہے، یعنی زبان سے ایک بات کہہ دی جائے مگر وہ دل کی گہرائیوں سے نہ نکلی ہو، جیسا کہ منافقین زبان سے حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتے تھے مگر دل سے نہیں مانتے تھے۔ قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱﴾﴾ (المنفقون) ''اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔''

صدق کی تیسری قسم کا تعلق عمل کی سچائی سے ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں کوئی تفاوت نہ ہو۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق ہو، مگر عمل کے ساتھ مطابقت نہ ہو۔ زبان، دل اور عمل کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ صحیح معنوں میں مؤمن وہی ہیں جن کا ظاہر ان کے دل کی ٹھیک ترجمانی کر رہا ہو۔ قرآن نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾ (الحجرات)

''مؤمن تو حقیقت میں بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔''

سچائی کی اس اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ سورۃ البقرۃ میں یوں فرمایا گیا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۱۷۷﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو، یوم آخر کو، ملائکہ کو، اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو، اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں، اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور (نیک لوگ وہ ہیں کہ) جب عہد کریں تو اسے وفا کریں، اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں ثابت قدم رہیں۔ یہی ہیں راست باز لوگ، اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

اس آیت کریمہ کی روشنی میں کامل سچے وہی ہیں جن کا ایمان درجۂ کمال تک پہنچا ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ نیک اعمال بجالاتے ہوں اور تیسرا یہ کہ وہ جانچ میں ہر طرح پورے اترتے ہوں۔ شریعت کی زبان میں یہی صدّیق ہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَالصِّدْقُ شَفِيْعِيْ)) ''صدق میرا ساتھی ہے''۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر یوں رقم طراز ہیں:

''صدق ہر شے کی اصلیت اور کمال قوت کو کہتے ہیں۔ عزم صادق اُسی ارادہ کو کہیں گے جو تام و قوی ہو۔ محبت صادق اسی محبت کو کہیں گے جو کامل و اصلی ہو۔ خبر صادق وہی اطلاع ہے جس میں اصلیت کے سب اجزاء کامل و قوی ہوں۔ قرآن مجید میں صدق کے کئی مقامات کا ذکر فرمایا گیا ہے، نبی ﷺ کو یہ دعا تلقین فرمائی گئی ہے:

﴿رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝۸۰﴾ (بنی اسراء یل)

''اے رب مجھے خوبی کے ساتھ پہنچائیو اور خوبی کے ساتھ لے جائیو اور مجھے اپنے پاس سے ایسا غلبہ دیجیو جس کے ساتھ نصرت ہو''۔ اس دعا میں ''مُدْخَلَ صِدْقٍ'' اور ''مُخْرَجَ صِدْقٍ'' کا سوال سکھلایا گیا ہے..... نبی ﷺ کا مکہ چھوڑ دینا، وطن سے دوری، تعلقات سے بے تعلقی اور راہِ ہجرت کی بادیہ پیمائی اس مُخْرَجَ صِدْقٍ میں داخل ہے۔ سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾ (یونس:۲)

''اور جو ایمان لے آئے ان کو بشارت سنائیے کہ ان کے رب کے پاس ان کو پورا مرتبہ ملے گا''۔ آیت کریمہ میں ''قَدَمَ صِدْقٍ'' کے وجود کی اطلاع اور بشارت دی گئی ہے۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ہے:

﴿وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ﴾ (الشعراء)

''اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھ۔''

اس آیت میں ''لِسَانَ صِدْقٍ'' کی دعا فرمائی ہے۔ لسان صدق سے مراد ثناءِ حسن ہے۔ یہ اس بندہ کے لیے بطور جزائے حسن عطا ہوتی ہے جس کے افعال و اعمال اور اقوال اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں معیارِ صدق پر پورے اترتے ہیں''۔ (رحمۃ للعالمین ﷺ جلد سوم، ص ۲۷۴)

محسن اعظم ﷺ کی حیاتِ طیبہ صدق و صفا کا مرقع تھی اور نبوت کے جلیل و جمیل منصب پر فائز ہونے سے قبل ہر سُوان کی صداقت و امانت کا شہرہ تھا۔ پوری قوم نے آپؐ کو صادق و امین کے لقب سے ملقّب کر رکھا تھا۔ صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر آپؐ نے اہل مکہ کو پیغامِ حق سنایا

تھا اور آغاز میں فرمایا: ''اے اہل قریش! اگر میں یہ کہوں کہ ان پہاڑیوں کے پیچھے سے ایک لشکر پر حملہ کرنے کے لیے آ رہا ہے تو کیا آپ میرا یقین کریں گے؟ سب نے بیک آواز جواب دیا: ''ہاں! ہم نے آپؐ کو ہمیشہ سچا پایا ہے''۔ حضرت محمد ﷺ نے شکریہ کے طور پر سر جھکایا اور پھر آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا: ''میں آپ لوگوں کو خبردار کرنے آیا ہوں کہ آپ نے میری بات کو نہ مانا تو آپ پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا''—— اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنی نبوت سے قبل کی چالیس سالہ زندگی کو شہادت کے طور پر پیش کیا تھا اور یہ آپؐ ہی کا اعزاز تھا کہ پورے مجمع نے آپؐ کی سچائی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

زندگی کی رعنائی و زیبائی اور شرفِ انسانی کا عروج صدق وصفا کے وصف میں مضمر ہے۔ صدقِ مقال اختیار نہ کرنے سے معیشت کا پہیہ بھی رک جاتا ہے۔ مکر وفریب اور جھوٹ کی بدولت کاروبار میں اختلال وفساد رونما ہوتا ہے جو دنیا و آخرت میں انسان کے خسارے اور نقصان کا موجب بنتا ہے۔ قرآن حکیم نے لینے اور دینے کے پیمانوں میں فرق کرنے والوں کو دوزخ کی وعید سنائی ہے۔

سچائی کی راہ دشوار گزار ضرور ہے' جس نے بھی حق کہا اس نے رات آرام کی نہیں گزاری' مگر صبر وثبات سے یہ گتھی آخر سلجھ جاتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے دعوت حق کا آغاز کیا تو اعدائے دین نے ان کے خلاف مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا جو تھمنے میں نہیں آ رہا تھا' مگر صبر واستقامت کے دامن سے وابستہ رہنے کی بنا پر بالآخر کامیاب وہی ہوئے۔ سورۃ العصر میں اسی عقدہ کو حل کیا گیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾

''زمانے کی قسم' انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے' اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

صدق وصفا سے تغافل نے ہمیں ذلت ونکبت سے دوچار کر کے رکھ دیا ہے۔ ہماری معیشت' سیاست' معاشرت' کذب وافتراء اور عیاری کی آئینہ دار ہے۔ جھوٹ کی سڑاند نے پوری فضا کو بدبودار کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلام کا نام جپنے کی حد تک ہم مسلم ہیں' مگر عملاً ہم اللہ کے باغی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

دینِ اسلام کے تین مراتب

حافظ محمد مشتاق ربانی

دین اسلام کے تین مراتب ہیں: (۱) اسلام' (۲) ایمان' اور (۳) احسان۔

یہ تینوں مراتب اس آیت مبارکہ میں بیان ہوئے ہیں:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾﴾ (النساء)

''پس آپؐ کے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپؐ کو منصف نہ بنائیں' اور جو فیصلہ آپؐ کر دیں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مؤمن نہ ہوں گے۔''

اس آیت میں حکم نہایت مؤکد انداز میں بیان ہو رہا ہے۔ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ﴾ قسم اور ﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ جواب القسم کے الفاظ معاملے کی نزاکت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی کریم ذات کی قسم کھا کر بیان کر رہا ہے یعنی قسم میں بھی تاکید کا اسلوب ہے۔

اس آیت کا اطلاق صرف آنحضور ﷺ کی زندگی ہی تک محدود نہ تھا بلکہ یہ قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ عہد نبوی میں جو مسلمانوں میں باہمی رنجشیں ہوتی تھیں' صرف ان رنجشوں کے خاتمے کے لیے آپ ﷺ سے رجوع کرنا ضروری تھا۔ وہ تو تھا ہی' لیکن ﴿فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ میں سارے معاملات آتے ہیں' چاہے وہ سیاسی ہوں' معاشرتی ہوں یا پھر معاشی اور اخلاقی۔ اگر ان میں وحی کی راہنمائی نہ ہو تو زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے پر بھی اونچ نیچ ہوگی' اختلافات اور جھگڑے ہوں گے' فساد اور بگاڑ پیدا ہوگا۔ لہٰذا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے کہ ہر معاملے کا حل شریعت سے ڈھونڈنا چاہیے' جو آنحضور ﷺ لائے۔ یہی قضاءِ نبوی ہے۔ اس حل کو آپ ﷺ کا فیصلہ سمجھنا چاہیے' جس کی تعمیل ایمان کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔

ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب ''مدارج السالکین'' (جلد دوم) کے باب منزلة التسلیم میں

سورۃ النساء کی آیت ۶۵ کے حوالے سے دین اسلام کے تین مراتب بیان کرتے ہیں:

فھذہ ثلاث مراتب : التحکیم' وسعة الصدر بانتفاء الحرج والتسلیم

''اس آیت میں تین مراتب بیان ہوئے ہیں۔ ایک تحکیم' دوسرا اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلہ کے بارے میں بغیر کسی شکایت کے سینے میں کشادگی' تیسرا دل و جان سے فیصلہ پر اطمینان کا اظہار کرنا۔''

انہی تینوں امور کی ذیل میں وضاحت کی جا رہی ہے:

☆ **تحکیم — مقامِ اسلام:** ہمارے اسلام کی تکمیل اسی صورت میں ہوگی جب ہم اللہ کے رسول ﷺ کی ذات کو اپنے معاملات میں حکم/حاکم بنائیں گے۔ سلبی انداز میں ارشاد ہے: ﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ ''آپؐ کے پروردِگار کی قسم! یہ لوگ مؤمن نہ ہوں گے جب تک اپنے ہر اختلافی مسئلے میں آپ ﷺ کو حاکم تسلیم نہ کریں''۔ اختلاف ہر جگہ پیدا ہونے کے امکانات ہیں' لیکن ایسی صورت میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ان اختلافات کے حل کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے رجوع کرنا چاہیے۔

دوسری جگہ ایجابی انداز میں ارشاد ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾﴾ (النساء)

''پس اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس بات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو۔ یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل (انجام) بھی اچھا ہے۔''

اس بارے میں حدیث نبوی ہے:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))[۱]

''تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کی خواہشاتِ نفس اُس (دین) کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لایا ہوں۔''

نزاعات کے حل کے لیے شریعت کی طرف رجوع کرنا ایک صالح عمل ہے' اور صحیح مسلم میں مروی حدیث جبریل علیہ السلام کی وضاحت سے مقصود بھی عمل ہے' کیونکہ اس میں توحید و رسالت کے بعد نماز' روزہ' حج' اور زکوۃ کا ذکر ہے۔ یہ سب اعمال ہیں۔ یہاں پر توحید و رسالت

(۱) رواہ فی شرح السُّنَة۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسُّنَة۔

کا اقرار بھی زبانی اور ظاہری طور پر ہے' کیونکہ باطنی طور پر اقرار ایمان کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

اپنے مسائل اور نزاعات کے حل کے لیے شریعت اسلامی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اگر طاغوتی اور غیر اسلامی قوانین سے اپنے فیصلے نمٹائیں گے تو ہم اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے' جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۶۰ میں بیان ہوا ہے جس میں **تحاکم الی الطاغوت** کا ذکر ہے۔ مسلمان حکومتوں کے لیے یہ مسئلہ نہایت حساس ہے۔ انھیں اپنے آئین' دستور اور قوانین کو شریعت کے فلٹر سے گزارنا چاہیے۔ آئینی اور قانونی طور پر جو چیزیں غیر شرعی اور شریعت سے متصادم دکھائی دیں انہیں ختم کرنا مسلمان حکومتوں کے لیے لازمی ہے' ورنہ ان کا کوئی الگ تشخص نہیں رہتا۔ سورۃ المائدۃ میں بیان ہے کہ جو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر' ظالم اور فاسق ہیں۔ ایسی حکومتوں کا ظالم اور فاسق ہونا متفق علیہ ہے' لیکن ان حکومتوں کی بالکل تکفیر کرنا قطعی طور پر ایک الگ مسئلہ ہے۔ اس بارے میں مفتیانِ کرام اور اسلامی سکالرز کی آراء کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

ہمارا رویہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ شرعی حکم کی حکمت معلوم ہونے پر ہی اس پر عمل کریں۔ قاعدہ یہی ہے کہ شرعی حکم کی حکمت معلوم ہو یا نہ ہو' ہم اسے بے چون و چرا مانیں اور اس پر عمل کریں۔ اہل ایمان کا رویہ تو یہ ہونا چاہیے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵۱﴾ (النور)

''مؤمنوں کی بات تو یہی ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بلائے جائیں تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کریں تو کہیں کہ ہم نے (حکم) سن لیا اور مان لیا۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اسی طرح سورۃ الاحزاب میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کے قصہ میں بیان ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ آنے کے بعد اہلِ ایمان کا اپنا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

بعد میں پیدا ہونے والے مسائل کے شرعی حل کے لیے اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ ظاہر بات ہے ایک ہی مسئلہ کے بارے میں عالمِ اسلام کے بہت سے مجتہدین کے ایک سے زیادہ اجتہادات سامنے آئیں گے۔ اس میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جو اجتہاد شریعت کی روح کے زیادہ قریب ہو' اس پر عمل پیرا ہوں۔ ایسا کرنا بھی اجر سے خالی نہ ہوگا۔

☆ قبولِ قلبی —— مقامِ ایمان: شریعت کے بارے میں شک نہ ہو۔ اسے گراں محسوس نہ کریں۔ جس طرح ظاہر میں اس پر عمل ہو رہا ہو' باطن میں بھی اس کے بارے میں نہایت مثبت سوچ رکھیں: ﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ﴾ ''اپنے دلوں میں شریعت کے بارے میں کوئی بوجھ نہ ہو''۔ یہ کیفیت اُس وقت ہوگی جب ہمارا ایمان مضبوط ہوگا۔ حدیث جبرئیل میں ایمان کی شرح یوں ملتی ہے:

((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ))

''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر' فرشتوں پر' اُس کی نازل کردہ کتابوں پر' اُس کے رسولوں پر' آخرت پر اور اچھی بری تقدیر پر ایمان رکھے۔''

حدیث کے ان کلمات سے مقصود باطنی تصدیق ہے۔ باطنی طور پر شریعت کے بارے میں حرج نہ ہو' یعنی شکایت اور تنگی نہ ہو' سینے میں کشادگی ہو' دل میں کوئی کدورت نہ ہو' شریعت پر پورا اعتماد ہو۔ شریعت کے نظام کو حق سمجھنا اور باقی تمام نظاموں کو باطل قرار دینا ایمان ہی کی تشریح ہے۔ شریعت کے بارے میں اندرونی طور پر اطمینان ہونا ایمان کی بقا کے لیے لازمی ہے۔

☆ تسلیم مطلق —— مقامِ احسان: فیصلے پر مکمل طور پر راضی ہونا' تنازعہ سے بالکل دستبردار ہو جانا۔ حدیث نبوی میں احسان کی جو تعریف ملتی ہے وہ بھی یہی ہے۔ حدیث جبریل میں احسان کے بارے میں فرمایا گیا:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))

''(احسان یہ ہے) کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تمہیں یہ کیفیت حاصل نہیں ہے تو (یہ مت بھولو کہ) وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

امام نوویؒ صحیح مسلم کی شرح ''المنہاج'' میں بیان کرتے ہیں کہ حدیث کے ان الفاظ سے مقصود عبادت میں اخلاص پیدا کرنا ہے یعنی عبادت کے دوران خشوع و خضوع ہو۔ مولانا محمد معراج الاسلام اپنی کتاب ''شرح حدیثِ جبریلؑ'' (پبلشر ادارہ منہاج القرآن' لاہور) میں بیان کرتے ہیں کہ ''انسان کی اس حالت کو حضرات صوفیاء کرام حالت مشاہدہ سے تعبیر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس رتبے پر فائز ہو کر انسان کے عمل میں ریاکاری' نفسانیت اور نمائش کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ انسان کا ہر عمل خوشنودیٔ الٰہی کے لیے ہوتا ہے۔''

﴿وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ میں بھی یہی ہدایت ہے کہ شریعت کے ہر حکم کو پورے اخلاص

اور کامل رضا جوئی کے ساتھ انشراحِ صدر سے مان لیا جائے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ﴾(لقمان:۲۲)

''اور جو شخص اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لے اور وہ محسن ہو تو اُس شخص نے فی الواقع مضبوط حلقے کو تھام لیا۔''

اس آیت مبارکہ میں تسلیم اور احسان کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ''احسان'' کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور کی تالیف ''اسلام' ایمان اور احسان: حدیث جبریلؑ کی روشنی میں'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''قرآن مجید کی اصطلاح ہے ''احسانِ اسلام'' یعنی اسلام میں خوبصورتی پیدا کرنا۔ ایک شخص کا اسلام تو یہ ہے کہ وہ محض مارے باندھے فرائض' مثلاً نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ادا کر رہا ہے۔ اس میں اس کی دلی آمادگی اور دلی جذبہ شامل نہیں ہے۔ منہیات کے معاملے میں بھی بے دلی اور تھڑدلے پن کے ساتھ' طبیعت کی عدم آمادگی سے محض خانہ پری کر رہا ہے' جبکہ ایک شخص پورے اہتمام اور توجہ کے ساتھ اور دل کی پوری آمادگی سے فرائض انجام دے رہا ہے' نواہی سے طبیعت کی پوری آمادگی کے ساتھ احتراز کر رہا ہے' نفلی عبادات پر بھی بھرپور توجہ ہے تو گویا اس کا اسلام' درجہ احسان کو پہنچ گیا ہے۔'' (ص ۵۹)

یہی اصل تصوف ہے۔ اس سے بڑھ کر اگر تصوف کا تصور پیش کیا جائے تو وہ محل نظر ہے۔ اس حد تک تصوف کے سب قائل ہیں' بلکہ تصوف کے لفظ کو احسان کی اصطلاح سے تبدیل کرنا چاہیے' اور قرآن کی اصطلاح کو فروغ دینا چاہیے۔ اس سے تصوف کی بعض لایعنی باتیں خود بخود زائل ہو جائیں گی اور دین کا یہ پہلو شفاف انداز میں ابھر کر سامنے آ جائے گا۔

یہ تینوں مراتب ایک دوسرے کے ساتھ نتھی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تینوں کی ترتیب سورۃ النساء کی زیر بحث آیت میں آئی ہے' جس کے تفسیری نکات ابن قیمؒ کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔ یہی ترتیب حدیث جبریل میں بھی بیان ہوئی ہے۔

اس مختصر مضمون کا محرک مجلّة الوعی الإسلامی الکویت (عربی) کا شمارہ اپریل ۲۰۱۲ ہے' جس کا افتتاحیہ اسی نقطۂ نظر پر مشتمل ہے جسے فیصل یوسف العلی نے تحریر کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ﴾ (الرعد:۴۱) ''اور اللہ حاکم ہے' اس کے حکم کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے۔'' ❁❁❁

اسلام کی خاتونِ اوّل

اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

(حالات‘ فضائل اور خدماتِ دینِ اسلام)

حافظ محمد زاہد☆

اس کائنات کی بہت سی چیزوں کو دوسری چیزوں پر فوقیت حاصل ہے‘ مثلاً جمعہ کے دن کو باقی دنوں پر‘ ماہ رمضان کو باقی گیارہ مہینوں پر اور لیلۃ القدر کو رمضان کی باقی راتوں پر۔ اسی طرح اس کائنات میں بہت سے انسان ایسے ہیں جن کو تمام بنی نوعِ انسان پر مختلف خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے‘ مثلاً انبیاء کو غیر انبیاء پر اور پھر انبیاء کرام علیہم السلام میں سے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی طرح وہ عورتیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہیں (چاہے قلیل مدت یا زیادہ مدت‘ جنہیں ازواجِ مطہرات اور اُمہاتُ المؤمنین رضی اللہ عنہن کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) ان کو بھی بنی نوعِ انسان کے طبقہ نسواں پر فضیلت اور برتری حاصل ہے۔ ان ازواجِ مطہرات میں سے بھی اوّلیت اور فضیلت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے‘ جو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی زوجہ اور اس اُمت کی پہلی ”ماں“ تھیں۔

اس مضمون میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مختصر سوانح حیات‘ خصوصی فضائل اور خدماتِ اسلام کو بیان کیا جائے گا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت دنیا کی تمام عورتوں پر واضح ہو جائے اور اُمتِ مسلمہ کی تمام عورتیں انہیں اپنا آئیڈیل بنا کر ان کے طرزِ زندگی کو اپنائیں تاکہ ان کو گھریلو زندگی میں سکون اور آخرت میں آرام میسر آئے۔

حسب ونسب اور ماضی کی ایک جھلک

آپؓ کا نام خدیجہ‘ لقب طاہرہ‘ اور کنیت اُمّ ہند تھی۔ آپؓ قبیلہ قریش کی ایک معزز شاخ بنی اسد سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپؓ کے والد کا نام خویلد بن اسد اور والدہ کا نام فاطمہ بنتِ زاہدہ

☆ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی لاہور۔ 03214291904

تھا۔ آپؓ کے والد عرب کے مشہور تاجر تھے اور ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ آپؓ شرافت‘ امانت‘ ایفائے عہد‘ سخاوت‘ غریب پروری‘ فراخ دلی اور عفت وحیا جیسی اعلیٰ صفات اور خوبیوں کے ساتھ واقعہ فیل سے ۱۵ سال پہلے بمطابق ۵۵۵ عیسوی اس دنیا میں تشریف لائیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خوبیاں آپؓ کی طبیعت کا لازمی جزو بن گئیں اور پورے عرب میں آپؓ کی اعلیٰ خوبیوں کا چرچا ہونے لگا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی پہلی شادی ابوہالہ تمیمی کے ساتھ ہوئی اور ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے: ہالہ اور ہند۔ ان کے انتقال کے بعد آپؓ کی دوسری شادی عتیق بن عاید مخزومی سے ہوئی اور ان سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام بھی ہند تھا۔ کچھ عرصے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا تو آپؓ نے شادی کا خیال دل سے نکال کر اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی تجارت کو سنبھالنا شروع کر دیا۔

کاروبار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنا سامانِ تجارت مقررہ اُجرت پر دیا کرتی تھیں اور اُنہیں اس مقصد کے لیے امانت دار اور شریف النفس شخص کی تلاش تھی۔ یہ وہ دور تھا جب حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت اور دیانت کا پورے عرب میں چرچا تھا اور آپؐ پورے عرب میں ”الامین اور الصادق“ کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو پیغام پہنچایا کہ آپ میرا سامانِ تجارت شام لے جائیں تو میں آپ کو دوگنا اجر دوں گی۔ آپؐ نے اس پیشکش کو قبول فرمایا اور حضرت خدیجہؓ کا سامانِ تجارت شام لے کر گئے۔

شام کے اس تجارتی سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ راستے میں راہب والا واقعہ پیش آیا کہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی کہا تھا: ”بلاشبہ یہ نبی ہے اور آخری نبی“۔ پھر حضرت خدیجہؓ کے غلام میسرہ نے خود بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے چند خرق العادت واقعات دیکھے‘ مثلاً اس نے دیکھا کہ دھوپ میں دو فرشتے آپؐ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ سفر سے واپسی پر میسرہ نے سفر کی ساری روداد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے گوش گزار کی اور آپؐ کی صداقت اور امانت کا بھی ذکر کیا۔ اس سے حضرت خدیجہؓ کے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت دوچند ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کی خواہش پیدا ہو گئی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نبی آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغامِ نکاح

قریش کا جو شخص بھی نکاح کے قابل تھا وہ حضرت خدیجہؓ سے شادی کا خواہش مند تھا‘

لیکن آپؓ نے رحمۃ للعالمین محمد بن عبداللہ ﷺ سے شادی کی خواہش کی اور اپنی سہیلی نفیسہ بنت اُمیہ کو شادی کا پیغام دے کر نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجا۔ وہاں نبی کریم ﷺ اور نفیسہ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی، خود نفیسہ کی زبانی سنیے:

نفیسہ: آپؐ نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟

محمد ﷺ: میں نادار اور خالی ہاتھ ہوں، کس طرح نکاح کر سکتا ہوں؟

نفیسہ: اگر کوئی ایسی عورت آپؐ سے نکاح کی خواہش مند ہو جو ظاہری حسن و جمال اور طبعی شرافت کے علاوہ دولت مند بھی ہو اور آپؐ کی ضروریات کی کفالت کرنے پر بھی خوش دلی سے آمادہ ہو، تو آپؐ اس سے نکاح کر لینا پسند کریں گے؟

محمد ﷺ: ایسی عورت کون ہو سکتی ہے؟

نفیسہ: خدیجہ بنت خویلد

آپ ﷺ نے اس کا ذکر اپنے چچا ابوطالب سے کیا تو آپؐ کے چچا اس پر خوش ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: اگر خدیجہ اس کے لیے آمادہ ہیں تو میں راضی ہوں۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود نبی کریم ﷺ سے شادی کی بات کی اور آپؐ نے اُن کی اِس پیشکش کو قبول فرمایا۔

نبی آخر الزماں ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی تقریب

نبی آخر الزماں ﷺ اور حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی تقریب حضرت خدیجہؓ کے گھر میں منعقد ہوئی۔ آپؐ اپنے چچا اور چند دوسرے رشتہ داروں، مثلاً حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے ہمراہ وقتِ مقررہ پر ان کے گھر گئے، جہاں پر حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار موجود تھے، جن میں عمرو بن اسد اور ورقہ بن نوفل قابلِ ذکر ہیں۔ آپؐ کے چچا ابوطالب نے عرب کے رواج کے مطابق نکاح کا خطبہ پڑھا۔ بعض تاریخی روایات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی طرف سے ورقہ بن نوفل نے جوابی کلمات کہے۔ عرب کے رواج کے مطابق نبی کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو پانچ سو طلائی درہم بطور حق مہر ادا کیے۔

شادی کے وقت نبی مکرم ﷺ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ۴۰ سال تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی خدمت گزاری اور وفا شعاری

حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد آپ ﷺ اُن کے ساتھ اُن کے گھر پر ہی رہنے لگے۔

آپؓ ایک خدمت گزار اور وفا شعار بیوی ثابت ہوئیں۔ آپؓ نے نبی اکرم ﷺ کی ساری ضرورتوں اور آرام کا خاص خیال رکھا اور آپؓ نے اپنا سارا مال و دولت نبی کریم ﷺ کے حوالے کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ جب تک زندہ رہیں آپؐ نے کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں کیا جو آپ ﷺ کو ناپسند ہو یا آپؐ کی مرضی کے خلاف ہو — آپؐ جب غارِ حرا میں غور و فکر کے لیے جاتے تو آپؓ نبی کریم ﷺ کے لیے کھانا لے کر جاتیں حالانکہ غارِ حرا مکہ کی آبادی سے دو تین میل کے فاصلے پر ہے اور اس کی چڑھائی بھی کافی مشکل ہے، لیکن آپؓ نے یہ سب کام بخوشی کیے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ایک غلام زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) تھا، جس سے نبی اکرم ﷺ کو خصوصی لگاؤ اور محبت تھی، تو آپؐ نے یہ غلام نبی کریم ﷺ کو ہدیہ کر دیا اور آپؐ نے حضرت زید کو خانہ کعبہ میں لے جا کر عرب کے رواج کے مطابق اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ اس کے بعد اہلِ عرب زید بن حارثہ کو ''زید بن محمد'' کہنے لگ گئے۔

[نوٹ: جب سورۃ الاحزاب کی آیت ۵: ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''(اے ایمان والو!) تم لے پالکوں کو اُن کے باپوں کے نام سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ صحیح ہے'' نازل ہوئی تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کو دوبارہ سے زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔]

سیماب اکبر آبادی نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی خدمت گزاری اور وفا شعاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ''حضرت خدیجہؓ حسین بھی تھیں، دولت مند بھی تھیں، شریف النسل بھی تھیں، شریف الخیال بھی تھیں، اور سب سے زیادہ جو فضیلت ان میں تھی وہ یہ ہے کہ اپنے شوہر کی بے حد اطاعت گزار تھیں۔''

اولاد کی اعلیٰ پرورش اور تربیت

آپؓ کے بطن سے حضرت قاسم، حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت اُمّ کلثوم، حضرت فاطمہ اور حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) پیدا ہوئے۔ دونوں صاحبزادے بچپن میں ہی انتقال کر گئے مگر بیٹیاں حیات رہیں، جبکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی واحد اولاد ہیں جو آپؐ کی وفات کے بعد بھی زندہ رہیں۔

دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اُس وقت بچے تھے، ان کو بھی نبی کریم ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کا مالی بوجھ کم کرنے کے لیے اپنی کفالت میں لے لیا۔ اب نبی کریم ﷺ کی چار بیٹیاں، حضرت علی، حضرت زید اور پھر حضرت خدیجہ کے پہلے خاوند سے دو بیٹے (رضی اللہ عنہم)

حضرت خدیجہ ؓ کی پرورش میں پلنے لگے۔ آپؓ نے ان کی بہت خوب پرورش کی، جس کا ثبوت ملاحظہ کریں کہ حضرت علی ؓ ''علم کا باب'' کہلوائے اور فصاحت و بلاغت کے ماہر بنے۔ اسی طرح حضرت ہند ؓ بھی فصاحت و بلاغت کے ماہر بنے۔ شمائل ترمذی کی اکثر روایات حضرت ہندؓ سے مروی ہیں اور نبی کریم ﷺ کے حسن و جمال اور حلیہ مبارک کی جو تعبیر حضرت ہندؓ نے کی ہے وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ کی بیٹیاں (ؓ) شرم و حیا کا پیکر اور صبر و استقامت کا پہاڑ ثابت ہوئیں۔ یہ سب حضرت خدیجہ ؓ کی پرورش اور تربیت کا نتیجہ ہے۔

وفات

حضرت خدیجہ ؓ نبوت کے دسویں سال اس فانی دنیا سے کوچ کر گئیں۔ نبی کریم ﷺ کو اُن کی جدائی کا حد درجہ افسوس اور دکھ تھا۔ آپؐ نے اس سال کو ''غم کا سال'' قرار دیا، اس لیے کہ اس سال آپ ﷺ کی دو محبوب اور قابل قدر ہستیاں اس دنیا سے کوچ کر گئیں: ایک آپؐ کے سرپرست چچا ابوطالب اور دوسری آپؐ کی خدمت گزار اور وفاشعار بیوی حضرت خدیجہ کبریٰ ؓ۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے انہیں لحد میں اتارا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ اُس وقت نماز جنازہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے حضرت خدیجہؓ کی نمازِ جنازہ ادا نہیں کی گئی۔

فضائل اور خدماتِ دین

حضرت خدیجہ ؓ کے فضائل اور خدماتِ دینِ اسلام بے شمار ہیں۔ اُنؓ کے فضائل و کمالات کے تو مستشرق بھی قائل ہیں۔ جرمن مؤرخ اسپرنگر نے تو حضرت خدیجہ ؓ کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ: ''اگر حضرت خدیجہ نہ ہوتیں تو آنحضرت ﷺ پیغمبر ہی نہ ہوتے''۔ ذیل میں انؓ کے فضائل اور خدماتِ دین میں سے چند ایک کو بیان کیا جاتا ہے:

دورِ جاہلیت میں بت پرستی سے بیزاری

دورِ جاہلیت کا عرب معاشرہ بت پرستی میں مبتلا تھا اور انہیں ان بتوں سے اتنا لگاؤ تھا کہ ان کے خلاف ایک بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس اندھیرے دور میں بھی روشنی کی چند گنی چنی شمعیں موجود تھیں جو فطرتاً بت پرستی سے نفرت کرتی تھیں۔ مردوں میں نبی کریم ﷺ کے علاوہ حضرات ابوبکر و عثمان ؓ قابلِ ذکر ہیں، جبکہ عورتوں میں حضرت خدیجہ ؓ تھیں جنہیں بُت پرستی سے فطرتاً نفرت تھی۔ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس دور کی واحد

خاتون تھیں جو شرک اور بت پرستی سے بیزار تھیں۔ آپؓ کی اسی پاکی کی بنا پر دورِ جاہلیت میں ہی آپ ''طاہرہ'' کے لقب سے جانی جاتی تھیں۔ اس حوالے سے مسند احمد میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت خدیجہ ؓ کے ایک پڑوسی کا کہنا ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو حضرت خدیجہؓ سے یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اَیْ خَدِیْجَۃُ وَاللّٰہِ لَا اَعْبُدُ اللَّاتَ وَ الْعُزّٰی، وَاللّٰہِ لَا اَعْبُدُ اَبَدًا))قَالَ: فَتَقُوْلُ خَدِیْجَۃُ :خَلَّ اللَّاتَ خَلَّ الْعُزّٰی، قَالَ :کَانَتْ صَنَمَھُمُ الَّتِیْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ثُمَّ یَضْطَجِعُوْنَ(۱)

''اے خدیجہ! اللہ کی قسم، میں لات اور عزیٰ کی عبادت کبھی نہیں کروں گا، اللہ کی قسم! میں ان کی عبادت کبھی نہیں کروں گا''۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ نے جواب میں کہا: آپ لات کو چھوڑیے، آپ عزیٰ کو چھوڑیے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجیے)۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ مشرکین کے بُتوں کے نام تھے جن کی عبادت کرنے کے بعد وہ اپنے بستروں پر لیٹتے تھے۔''

اسلام کی خاتونِ اول اور نبی اکرم ﷺ کی زوجۂ اوّل

حضرت خدیجہ ؓ عورتوں بلکہ بنی نوعِ انسان میں سب سے پہلے ایمان لانے والی اور نبی مکرم ﷺ کی پہلی بیوی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں آپؓ اسلام کی بھی خاتونِ اوّل تھیں اور نبی مکرم ﷺ کی بھی۔ شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پچیس سال رہیں، اُن کی زندگی میں آپؐ نے کسی عورت سے شادی نہیں کی۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں:

لَمْ یَتَزَوَّجِ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی خَدِیْجَۃَ حَتّٰی مَاتَتْ (۲)

''نبی اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی یہاں تک کہ آپؓ وفات پا گئیں۔''

نبوت کے وقت دلاسہ دینے والی

ایک طرف تو آپؓ نے شادی کے بعد رسول اللہ ﷺ کی ہر طرح سے خدمت کی اور اپنا سارا مال و دولت بھی آپ ﷺ کے لیے وقف کر دیا تو دوسری طرف جب آپؐ کو غارِ حرا میں نبوت ملی تو آپؐ نے گھر آ کر سارا واقعہ حضرت خدیجہؓ کے گوش گزار کیا، اُس وقت آپ ﷺ کو (بربنائے بشریت) دلاسے کی جو ضرورت تھی اُسے ہماری ماں حضرت خدیجہ کبریٰ ؓ نے

پورا کیا اور آپؓ کے اوصاف ایسے فصیح و بلیغ انداز میں بیان کیے کہ ان الفاظ نے اس موقع پر مرہم کا کام کیا۔ آپؓ نے فرمایا:

كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (۳)

''اللہ کی قسم' اللہ تعالیٰ آپؓ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپؓ تو صلہ رحمی کرتے ہیں' ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں' محتاجوں کے لیے کماتے ہیں' مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں۔''

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو اپنے چچا کے بیٹے ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر گئیں' جنہوں نے سارا واقعہ سن کر کہا: یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا آپ ﷺ کو نبوت ملنے کے وقت دلاسہ دینا اور پھر آپؓ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر جانا ایسی خصوصیات ہیں کہ جن تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اُمتِ مسلمہ کی ''صِدِّیقۃُ الکُبریٰ'' ہونے کا شرف

نبی اکرم ﷺ جب غارِ حرا سے واپس تشریف لائے اور سارا ماجرا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سنایا اور ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کے نبی ہونے کو بیان کیا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی تصدیق کی اور آپؐ پر ایمان لائیں۔ محدثین و مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ بنی نوعِ انسان میں سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنے والی حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ جب بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کرتے تو ان کی خوب تعریف کرتے تھے۔ ایک دن مجھے غیرت آئی اور میں نے کہا کہ آپ کیا اتنی کثرت کے ساتھ ایک سرخ مسوڑھوں والی عورت کا ذکر کرتے رہتے ہیں' حالانکہ ان کے بدلے میں اللہ نے آپ کو اس سے بہترین بیویاں عطا کر دی ہیں؟ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَبْدَلَنِىَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ خَيْرًا مِنْهَا' قَدْ آمَنَتْ بِىْ اِذْ كَفَرَ بِىَ النَّاسُ' وَصَدَّقَتْنِىْ اِذْ كَذَّبَنِىَ النَّاسُ' وَوَاسَتْنِى بِمَالِهَا اِذْ حَرَمَنِىَ النَّاسُ' وَرَزَقَنِىَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَلَدَهَا اِذْ حَرَمَنِىْ اَوْلَادَ النِّسَاءِ)) (۴)

''اللہ نے مجھے اُسؓ کے بدلے میں اس سے بہتر کوئی بیوی نہیں دی۔ وہ مجھ پر اُس وقت ایمان لائیں جب لوگ میرا انکار کر رہے تھے' اور میری اُس وقت تصدیق کی جب لوگ

میری تکذیب کر رہے تھے' اور اپنے مال سے میری ہمدردی اُس وقت کی جبکہ لوگوں نے مجھے اس سے دور رکھا' اور اللہ نے مجھے اُس سے اولاد عطا فرمائی جبکہ میری دوسری بیویوں سے میرے ہاں اولاد نہ ہوئی۔''

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اِسی تصدیق کی وجہ سے انہیں امت کی ''صدیقہ کبریٰ'' ہونے کا شرف حاصل ہے' جس طرح مردوں میں ''صدیق اکبر'' ہونے کا اعزاز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بے پناہ محبت

نبی کریم ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اور حضرت خدیجہؓ کو آپ ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ آپؐ نے ان کی زندگی میں دوسری شادی کا سوچا تک نہیں اور پچیس سال آپؐ نے ان کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزاری۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی محبت کا اندازہ ذیل میں بیان کردہ حدیث سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

مَا غِرْتُ عَلٰى اَحَدٍ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ ﷺ مَا غِرْتُ عَلٰى خَدِيْجَةَ وَمَا رَأَيْتُهَا' وَلٰكِنْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا' وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يُقَطِّعُهَا اَعْضَاءً' ثُمَّ يَبْعَثُهَا فِىْ صَدَائِقِ خَدِيْجَةَ، فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهٗ: كَاَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ فِى الدُّنْيَا اِمْرَأَةٌ اِلَّا خَدِيْجَةُ، فَيَقُوْلُ: ((اِنَّهَا كَانَتْ وَكَانَتْ وَكَانَ لِىْ مِنْهَا وَلَدٌ)) (۵)

''مجھے رسول اللہ ﷺ کی بیویوں میں سے کسی پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا کہ خدیجہؓ پر آیا' حالانکہ میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ لیکن نبی اکرم ﷺ ان کو کثرت سے یاد کرتے تھے اور کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جب بکری ذبح فرماتے' پھر اس کے حصے الگ الگ کرتے تو انہیں خدیجہؓ کی سہیلیوں کے ہاں بھیجتے۔ (حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ) کبھی کبھی میں آپؐ سے کہہ دیتی کہ کیا اس دنیا میں صرف خدیجہ ہی ایک عورت ہے؟ آپؐ فرماتے: ''وہ ایسی تھیں' ایسی تھیں (یعنی ان کی خدمات اور اوصاف کا ذکر کرتے) اور (یہ بھی فرماتے کہ) ان سے میری اولاد ہوئی۔''

جس عورت پر اس کی سوتن (اور سوتن بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسی) کو رشک آئے تو آپ اور میں اس پاکیزہ خاتون کی فضیلت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں! مسلم کی ایک روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ باتیں سن کر فرمایا:

((اِنِّىْ قَدْ رُزِقْتُ حُبَّهَا)) (۶)

''مجھے انؓ کی محبت (ربّ العالمین کی طرف سے) عطا کی گئی ہے۔''

نبی کریم ﷺ کا فرمان: ان سے میری اولاد ہوئی!

ماقبل بیان کردہ حدیث میں ان کی ایک بے مثل خوبی کا بھی تذکرہ آیا کہ آپؐ کی اولاد صرف انہی کے بطن سے ہوئی اور آپؐ کی نسل بھی حضرت خدیجہؓ کی اولاد سے ہی آگے بڑھی، جبکہ باقی ازواج مطہرات ؓ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس کی تائید ماقبل بیان کردہ مسند احمد کی روایت سے بھی ہوتی جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((وَرَزَقَنِیَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ وَلَدَھَا اِذْ حَرَمَنِیْ اَوْلَادَ النِّسَاءِ)) ''اور اللہ نے مجھے اُس سے اولاد عطا فرمائی جبکہ میری دوسری بیویوں سے میرے ہاں اولاد نہ ہوئی۔''

حضرت ماریہ قبطیہ ؓ کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جن کا نام ابراہیم (ؓ) رکھا گیا اور وہ بچپن میں ہی وفات پا گئے۔ یہاں یہ بات نوٹ کر لیں کہ حضرت ماریہؓ نبی کریم ﷺ کی منکوحہ نہیں، مملوکہ تھیں جن کو اسکندریہ کے حکمران نے باقی ہدایا کے ساتھ بطور ہدیہ آپؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

مصائب ومشکلات میں نبی اکرم ﷺ کی دل جوئی

حضرت خدیجہ ؓ کی اسلام کے بارے میں بہت خدمات ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تو غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور طرح طرح کے مظالم آپؐ پر ڈھائے گئے۔ ایسے مواقع پر حضرت خدیجہؓ کی تسلی اور حوصلہ مرہم کا کام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ نبی مکرم ﷺ کو مشرکین کی تردید اور تکذیب سے جو صدمہ پہنچتا وہ حضرت خدیجہ ؓ کے پاس آ کر دور ہو جاتا کیونکہ وہ آپؐ کو تسلی دیتیں، حوصلہ افزائی کرتیں اور مشرکین عرب کی بدسلوکیوں کو ہلکا کر کے پیش کرتی تھیں۔ اس حوالے سے اُن کا یہ قول تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ وہ فرماتیں: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں، بھلا کوئی ایسا رسول آج تک آیا ہے جس سے لوگوں نے تمسخر نہ کیا ہو؟''

شعبِ ابی طالب کے صبر آزما دنوں میں نبی کریم ﷺ کی ساتھی

حضرت خدیجہ ؓ نے نبی کریم ﷺ کا ہر مشکل سے مشکل وقت میں ساتھ دیا۔ جب عرب نے دیکھا کہ حضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا دینِ اسلام عرب میں پھیلتا جا رہا ہے تو انہیں اس پر کافی تشویش ہوئی اور انہوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ قبیلہ بنو ہاشم کا ہر طرح سے بائیکاٹ کیا جائے اور انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ محمد (ﷺ) کا ساتھ چھوڑ دیں۔ لیکن بنو ہاشم نے آپ ﷺ

کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا اور ابوطالب کے کہنے پر بنو ہاشم اور بنو طالب کے سب لوگ (سوائے ابولہب کے) شعب ابی طالب میں چلے گئے تاکہ وہاں محمد ﷺ کی حفاظت کر سکیں۔ یہ دن نبی کریم ﷺ اور ان کا ساتھ دینے والوں کے لیے بہت سخت تھے۔ ان حالات میں حضرت خدیجہؓ نے نبی کریم ﷺ کا ساتھ ڈٹ کر دیا اور ہر مشکل سے مشکل موقع پر آپؐ کا حوصلہ بڑھایا۔ عرب میں ''سیّدہ'' کے لقب سے مشہور اسلام کی خاتون اول کو ان دنوں میں پتے اور درختوں کی چھال کھانی پڑی تو آپؓ نے ان حالات کو بھی انتہائی صبر سے برداشت کیا۔

اس موقع پر گر آپؓ چاہتیں تو اس محاصرہ سے الگ ہو سکتی تھیں، اس لیے کہ آپؓ کا تعلق تو بنی اسد سے تھا اور عرب کے تمام لوگ آپ کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن حضرت خدیجہؓ نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رہنا پسند کیا۔

شعب ابی طالب میں مسلمانوں کا محاصرہ تقریباً تین سال رہا۔ اس دوران حضرت خدیجہ ؓ کے چند قریبی رشتہ دار بالخصوص حکیم بن حزام (جو ابھی اسلام کی دولت سے مالا مال نہیں ہوئے تھے) موقع دیکھ کر کھانے پینے کا سامان دے جاتے تھے۔

''مبلّغہ اسلام'' کے خطاب کی حق دار

محدثین اور مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے اسلام لانے والی شخصیت حضرت خدیجہ ؓ ہیں۔ ایمان لانے کے بعد اسلام کی خاتونِ اول نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اسلام کی تبلیغ کا فریضہ بھی سرانجام دیا اور نبوت کے پہلے تین سالوں میں ۱۳۳ لوگ مشرف باسلام ہوئے، جن میں ۲۷ خواتین (حضرت ابوبکر کی بیوی اسماء، حضرت عمر کی بہن فاطمہ، اسماء بنت عمیس ؓ وغیرہ) بھی شامل تھیں جو حضرت خدیجہؓ کی تبلیغ پر مشرف باسلام ہوئیں (یہی وہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے ''السابقون الاولون'' کے لقب سے یاد فرمایا ہے)۔ اِن خدمات کی وجہ سے حضرت خدیجہ ؓ بجا طور پر ''مبلغہ اسلام'' کے خطاب کی حق دار ہیں۔

حضرت خدیجہ ؓ کی دین اسلام کے بارے میں خدمات کی بنا پر نبی مکرم ﷺ نے اُنؓ کو تمام عورتوں کے لیے قابلِ اتباع قرار دیا۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((حَسْبُكَ مِنْ نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ :مَرْيَمُ ابْنَةُ عِمْرَانَ وَ خَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ وَ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَ آسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ)) (۷)

”تمہارے (اتباع و اقتدا کرنے) کے لیے چار عورتیں ہی کافی ہیں: مریم بنت عمران‘ خدیجہ بنت خویلد‘ فاطمہ بنت محمدؐ اور فرعون کی بیوی آسیہ۔“

سیرت ابن ہشام میں حضرت خدیجہ ؓ کی خدماتِ دینِ اسلام کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ”حضرت خدیجہ ؓ اسلام کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی مشیر تھیں۔“

اُمتِ محمدیہ کے طبقہ نسواں میں سب سے افضل خاتون

نبی کریم ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کو (سابقہ امتوں کی) اور حضرت خدیجہ ؓ کو (اس امت کی) سب سے افضل خاتون قرار دیا ہے۔ حضرت علی ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((خَيْرُ نِسَائِهَا مَرْيَمُ ابْنَةُ عِمْرَانَ وَخَيْرُ نِسَائِهَا خَدِيْجَةُ)) (۸)

”(سابقہ) امت کی عورتوں میں سب سے افضل مریم بنت عمران ہیں اور (اس) امت کی عورتوں میں سب سے افضل خدیجہ ہیں۔“

ربّ العالمین کا سلام اور جنت میں موتیوں والے گھر کی بشارت

حضرت خدیجہ کبریٰ ؓ نے ۲۵ سال تک محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی اور ہر طرح سے آپؐ کا ساتھ دیا۔ اسلام کی تبلیغ میں بھی آپؓ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی خدمات کی بدولت اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دنیا میں ہی جنت کی بشارت دے دی۔ حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں:

أَتٰى جِبْرِيْلُ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذِهِ خَدِيْجَةُ قَدْ اَتَتْ مَعَهَا اِنَاءٌ فِيْهِ اِدَامٌ اَوْطَعَامٌ اَوْشَرَابٌ، فَاِذَا هِيَ اَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا عَزَّ وَجَلَّ وَمِنِّيْ وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَا صَخَبَ فِيْهِ وَلَا نَصَبَ (۹)

”جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اللہ کے رسول! یہ خدیجہ آ رہی ہیں‘ ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں سالن‘ کھانا یا پانی ہے۔ جب وہ آپؐ کے پاس آئیں تو ان کو ان کے بلند مرتبہ پروردگار اور میری طرف سے سلام کہیے اور ان کو جنت میں موتیوں والے گھر کی بشارت دیجیے جہاں نہ کوئی شور شرابہ ہوگا اور نہ تھکن ہوگی۔“

اس روایت میں حضرت خدیجہ ؓ کے دو خصوصی فضائل کا ذکر ہے: (۱) اللہ تعالیٰ اور جبریل علیہ السلام کا ان کو سلام کرنا‘ اور (۲) ان کو جنت میں موتیوں والے گھر کی بشارت ملنا۔

حواشی

(۱) مسند احمد‘ کتاب باقی مسند الشامیین‘ باب حدیث جار لخدیجة بنت خویلد‘ ح۱۷۲۶۸۔
(۲) صحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابة‘ باب فضائل خدیجة اُمّ المؤمنین۔
(۳) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الوحی‘ باب بدء الوحی۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بدء الوحی الی رسول اللّٰہ ﷺ۔
(٤) مسند احمد‘ کتاب باقی مسند الانصار‘ باب حدیث السیدة عائشة‘ ح۲۳۷۱۹۔
(٥) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب تزویج النبی ﷺ خدیجة و فضلها۔
(٦) صحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابة‘ باب فضائل خدیجة اُمّ المؤمنین۔
(۷) سنن الترمذی‘ ابواب المناقب‘ باب فضل خدیجة۔
(۸) صحیح البخاری‘ کتاب احادیث الانبیاء‘ باب ﴿**و اذ قالت الملئكة یا مریم ان اللّٰہ اصطفٰك وطهرك**﴾۔ وصحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابة‘ باب فضائل خدیجة اُمّ المؤمنین۔
(۹) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب تزویج النبی ﷺ خدیجة و فضلها۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الفضائل الصحابة‘ باب فضائل خدیجة اُمّ المؤمنین۔

اخذ و استفادہ

☆ طبقات ابن سعد
☆ سیرت ابن ہشام
☆ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ
☆ الاستیعاب‘ ابن عبدالبر
☆ ازواجِ مطہرات‘ حافظ افروغ حسن
☆ سیرت خدیجۃ الکبریٰ‘ سیماب اکبرآبادی
☆ دس بڑے مسلمان‘ اسماعیل پانی پتی
☆ مسلمانوں کی مائیں‘ رازق الخیری

مولانا وحیدالدین خان

اپنے الفاظ کے آئینے میں (۵)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

اس سلسلہ وار مضمون کی سابقہ قسط میں ہم نے مولانا وحیدالدین خان صاحب کے تصورِ اقامت دین اور نفاذ شریعت کا جائزہ لیا تھا۔ ذیل کی قسط میں ہم ان کے تصورِ جہاد اور تصورِ امن کا جائزہ لے رہے ہیں۔

تصوّرِ جہاد

مولانا وحیدالدین خان صاحب صرف دفاعی جہاد کے قائل ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اسلام میں صرف دفاعی جنگ جائز ہے اور اس کا اختیار بھی صرف حاکم قوت کو حاصل ہوتا ہے' کسی غیر حکومتی گروہ کو مسلح جہاد کی ہرگز اجازت نہیں۔ اسلام میں اگرچہ دفاع کے لیے جنگ کی اجازت ہے' لیکن اسی کے ساتھ شدت سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے' یعنی دفاع کے حالات پیدا ہونے کے باوجود آخری حد تک جنگ سے اعراض کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں صرف تین بار باقاعدہ جنگ ہوئی' یعنی بدر اور اُحد اور حنین کی جنگ۔ اس کے سوا جن کو غزوہ کہا جاتا ہے' وہ یا تو صرف پرامن مہمیں تھیں' مثلاً غزوۂ تبوک (۹ ہجری)' یا جنگ کی حالت پیدا ہونے کے باوجود جنگ سے اعراض مثلاً غزوۂ خندق (۵ ہجری) یا بعض واقعات کی صورت میں صرف جھڑپیں (skirmishes)۔ غزوۂ خیبر (۷ ہجری) کی نوعیت اسی قسم کی ہے۔ جنگ کے باقاعدہ واقعات بھی اس طرح ہوئے کہ ان میں عملاً صرف آدھے دن کی لڑائی ہوئی' یعنی دوپہر کے بعد جنگ کا آغاز اور شام تک جنگ کا خاتمہ' جیسا کہ غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد اور غزوۂ حنین کے موقع پر پیش آیا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا درست ہوگا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں مجموعی طور پر صرف ڈیڑھ دن

کے لیے جنگ کی۔'' (ماہنامہ الرسالہ' مارچ ۲۰۰۸ء' ص ۴-۵)

خان صاحب کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ آج کے دور میں اقدامی جہاد و قتال منسوخ ہو چکا ہے۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''قتال کی حیثیت گویا کہ وائلنٹ ایکٹوازم (violent activism) کی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا طریق کار وہ ہے جس کو پیس فل ایکٹوازم (peaceful activism) کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج کی دنیا میں وائلنٹ ایکٹوازم منسوخ ہوگیا ہے اور اس کی جگہ پیس فل ایکٹوازم نے لے لی ہے۔ اب پیس فل ایکٹوازم کے تحت ہر قسم کی سرگرمیوں کا حق انسان کو مل چکا ہے' صرف ایک استثنا کے ساتھ کہ وہ تشدد نہ کرے۔'' (ماہنامہ الرسالہ' اکتوبر ۲۰۰۷ء' ص ۱۵)

خان صاحب کا یہ دعویٰ کہ اب صرف دفاعی جہاد و قتال جائز ہے اور اقدامی قتال منسوخ ہو چکا ہے' احادیثِ رسول کے خلاف ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِيْ نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اَلْاَجْرُ وَالْمَغْنَمُ)) (صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الجهاد ماض مع البر والفاجر' دار طوق النجاة' الطبعة الأولى' ١٤٢٢ھ' ٤/٢٨)

''گھوڑوں کی پیشانیوں میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن تک کے لیے خیر رکھ دی ہے۔ آخرت میں اجر و ثواب اور دنیا میں مال غنیمت۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر 'اَلْجِهَادُ مَاضٍ مَعَ الْبِرِّ وَالْفَاجِرِ' کے نام سے عنوان باندھ کر اس کے دوام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((لَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ عَلٰى مَنْ نَاوَاهُمْ حَتّٰى يُقَاتِلَ آخِرُهُمُ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ)) (سنن أبی داؤد' کتاب الجهاد' باب فی دوام الجهاد' المکتبة العصریة' بیروت' ٤/٣)

''میری اُمت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی اور اپنے مخالفین پر حاوی رہے گی یہاں تک کہ ان کا آخری حصہ مسیح دجال سے قتال کرے گا۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو 'صحیح' کہا ہے۔ (ایضاً) امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس روایت پر 'دوام جهاد' کے نام سے باب باندھا ہے جو جہاد کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک روایت جسے امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے ہی نقل کیا ہے اور اگرچہ سند کے اعتبار سے قوی تو نہیں ہے لیکن ایک 'شاہد' کے طور پر اسے نقل کیا جا سکتا ہے' جیسا کہ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے

بھی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد 'سکوت' اختیار کیا ہے' میں بھی جہاد کے دائمی ہونے کا اشارہ موجود ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

((وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى اَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ اُمَّتِي الدَّجَّالَ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ)) (سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب الغزو مع أئمة الجور)

''اور جہاد اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے یہاں تک کہ اس امت کا آخری حصہ مسیح دجال سے قتال کرے گا' اور اس جہاد کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل روک نہیں سکے گا۔''

یہ واضح رہے کہ ان روایات میں جہاد اور قتال دونوں الفاظ وارد ہوئے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جہاد سے مراد علماء و مجاہدین دونوں کا جہاد ہیں۔ علماء دین کے 'فکری غلبہ' کے لیے جہاد کرتے ہیں تو مجاہدین اس کے 'عملی غلبہ' کے لیے۔ اسلام کا تفوق جس قدر دلیل و برہان کی سطح پر مطلوب ہے' اسی نسبت سے سیاسی غلبہ بھی مقصود ہے۔ ان روایات میں دائمی جہاد سے مراد اہلِ علم کی جماعت کا جہاد بھی ہے' اس کی دلیل صحیح مسلم کی ایک روایت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَلَاتَزَالُ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ)) (صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب قوله ﷺ لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق، دار إحياء التراث العربي، بيروت، ۱۵۲۴/۳)

''اللہ تعالیٰ جس سے خیر کا ارادہ رکھتے ہیں تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتے ہیں' اور میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی۔''

یہی وجہ ہے کہ امام بخاری اور ان کے استاذ علی بن مدینی رحمہما اللہ کے نزدیک اس جماعت سے مراد محدثین کی جماعت ہے۔ (سنن الترمذي، أبواب الفتن، باب ماجاء في الشام، دار الغرب الإسلامي، بيروت، ۱۹۹۸ء، ۵۵/۴)

اسی طرح ان روایات میں جہاد و قتال سے مراد مجاہدین کا جہاد و قتال بھی ہے' جیسا کہ سنن النسائی کی روایت کے الفاظ ہیں:

فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَذَالَ النَّاسُ الْخَيْلَ وَوَضَعُوا السِّلَاحَ وَقَالُوْا لَا جِهَادَ قَدْ وَضَعَتِ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا' فَاَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِوَجْهِهٖ وَقَالَ: ((كَذَبُوا الْآنَ الْآنَ جَاءَ الْقِتَالُ' وَلَا يَزَالُ مِنْ اُمَّتِيْ اُمَّةٌ

يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ وَيُزِيْغُ اللّٰهُ لَهُمْ قُلُوْبَ اَقْوَامٍ' وَيَرْزُقُهُمْ مِنْهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ وَحَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ وَالْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِيْ نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) (سنن النسائي، كتاب الخيل، مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الثانية، ۱۹۸۶ء، ۲۱۴/۶)

''ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں نے اپنے گھوڑوں کو بے قیمت بنا دیا ہے' ہتھیار رکھ دیے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اب کوئی جہاد نہیں ہے' جنگ ختم ہو چکی ہے۔ پس اللہ کے رسول ﷺ قائل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''وہ جھوٹ بول رہے ہیں' جنگ تو اب شروع ہوئی ہے۔ اور میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر قتال کرتی رہے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے لوگوں کے دلوں کو جھکا دے گا اور انہیں ان کے سبب سے رزق دے گا' یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے اور اللہ کا وعدہ آ جائے۔ اور گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت کے دن تک کے لیے خیر باندھ دی گئی ہے۔''

علامہ البانی ؒ نے اس روایت کو 'صحیح' قرار دیا ہے۔ (ایضاً) پس جہاد و قتال ایک شرعی حکم کے طور پر قیامت تک باقی ہے اور اس کی منسوخی کا دعویٰ ایک باطل دعویٰ ہے' جس کی کوئی دلیل عقل و نقل میں موجود نہیں ہے۔ اس کے خلافِ عقل ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ دنیا کی ہر ریاست' چاہے وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی' فوجی و عسکری طاقت کی حامل ہے۔

ہمارے ہاں دو انتہائیں پیدا ہوئی ہیں۔ ایک انتہا تو یہ ہے کہ جہاد و قتال کی آیات سے دعوت و تبلیغ کا منہج منسوخ ہو چکا ہے اور اب قیامت تک مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل جنگ ہی ہے۔ یہ متشدّدین کا نقطہ نظر ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ جہاد و قتال کا منہج منسوخ ہو چکا اور اب قیامت تک اسلام کے نفوذ و نفاذ کا واحد منہج دعوت و تبلیغ اور منت و سماجت ہی ہے۔ یہ متجدّدین کا نقطہ نظر ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے مابین کتاب و سنت کا معتدل موقف یہ ہے یہ دونوں مناہج تا قیامت باقی ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں مسلمان اپنے حالات' اہلیت اور اسباب و وسائل کے اعتبار سے ان میں سے جو بھی منہج زیادہ مناسب حال' مفید اور نتیجہ خیز ہو' اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ تو ہر حال میں جاری رہے گی البتہ قتال کی فرضیت کے لیے شرعی قیود اور شرائط کا ہونا ضروری ہے جن کی وضاحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔

تصورِ امن

تصورِ جہاد کی طرح مولانا وحید الدین خان صاحب کا تصورِ امن بھی بہت ہی عجیب قسم کی منطق پر استوار ہے۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''تشدد کی دو قسم ہے۔ ایک' غیر فعّال تشدّد (passive violence)۔ اور دوسرا' فعال تشدد (active violence)۔ غیر فعال تشدد یہ ہے کہ آپ دوسروں کو ظالم بتا کر ان سے نفرت کریں۔ اور فعال تشدد یہ ہے کہ آپ دوسروں کو ظالم بتا کر ان کے خلاف جارحانہ کاروائی شروع کر دیں۔ یہ دونوں صورتیں اسلام میں یکساں طور پر گناہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ دونوں میں سے جس تشدد کا ارتکاب کریں' آپ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کے مرتکب قرار پائیں گے۔ دونوں قسم کے تشدد کے درمیان صرف ظاہر کا فرق ہے' حقیقت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔'' (ماہنامہ الرسالہ' ستمبر ۲۰۰۹ء' ص ۹)

ظالم کو ظالم کہنا اور اس سے ظلم کا بدلہ لینا دونوں ہی کتاب وسنت کی تعلیمات ہیں اور اس بارے میں بیسیوں نصوص موجود ہیں' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ﴾ (النساء: ۱۴۸)

''اللہ تعالیٰ کسی کی برائی کا تذکرہ بلند آواز میں پسند نہیں کرتا سوائے مظلوم کے [یعنی مظلوم کو اس کی اجازت ہے کہ وہ ظالم کے خلاف آواز بلند کرے]۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ اہل ایمان وتقویٰ کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝۳۹﴾ (الشوریٰ)

''اور ان پر جب کوئی ظلم ہوتا ہے تو وہ اس کا بدلہ لیتے ہیں۔''

کتاب وسنت کی ان معتدل تعلیمات کے برعکس خان صاحب امت مسلمہ کو مسیحی تعلیمات کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''معرفت صرف ان عورتوں اور مردوں کو ملتی ہے جو ہمیشہ مثبت سوچ کے ساتھ رہنے والے ہوں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کے لیے بھی موافق حالات کا ملنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں مثبت سوچ پر قائم رہنے کا فارمولا صرف ایک ہے' اور وہ ہے **یک طرفہ اخلاقیات** (unilateral ethics) **یعنی یک طرفہ طور پر دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا' خواہ وہ اچھا سلوک کرتا ہو یا برا سلوک۔**'' (ماہنامہ الرسالہ' جون ۲۰۱۱ء' ص ۲۴)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کی نفسیات اور مسیحی لوگوں کی نفسیات کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی جو سیاسی تاریخ بنی اور ان کے یہاں جو لٹریچر تیار ہوا' اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا ذہن یہ بنا کہ دشمن سے لڑو: Fight your enemy۔ اس کے برعکس' مسیحی لوگوں کا ذہن ان کی روایات کے مطابق' یہ بنا کہ دشمن سے محبت کرو: Love your enemy۔ یہی نفسیات دونوں قوموں کے اندر عمومی طور پر پائی جاتی ہے۔ جہاں تک صلیبی جنگوں' یا پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کا معاملہ ہے' وہ مسیحی عوام کی نفسیات کا مظاہرہ نہ تھا' بلکہ وہ کچھ مسیحی لیڈروں کی سیاسی معرکہ آرائی اور کشور کشائی کا نتیجہ تھا۔'' (ماہنامہ الرسالہ' جنوری ۲۰۱۰ء' ص ۲۹)

امر واقعہ یہ ہے کہ خان صاحب مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کا کوئی موقع یا تاویل ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ عیسائیوں اور مسیحیت کے گن گاتے ہیں جبکہ مسلمانوں کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکا میں غیر متوقع نوعیت کا بھیانک واقعہ ہوا۔ ایک خودکش ٹیم نے امریکا کے چار ہوائی جہازوں کو ہائی جیک کر لیا اور ان کو اڑاتے ہوئے لے جا کر نیویارک اور واشنگٹن کے اسکائی اسکریپرس (بلند بالا عمارتوں) سے ٹکرا دیا۔ اس کے نتیجہ میں ہولناک تباہی برپا ہوئی۔ تقریباً سات ہزار آدمی اچانک ہلاک ہو گئے' وغیرہ۔ یہ گویا امریکا پر ایک فضائی حملہ تھا۔ اس کے بعد امریکا نے انتقامی کارروائی کے طور پر ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان کے اوپر بمباری شروع کر دی' کیوں کہ امریکا کے نزدیک ۱۱ ستمبر کے واقعہ کا ماسٹر مائنڈ اسامہ بن لادن ہے' جس کو افغانی طالبان کی پوری حمایت حاصل ہے اور جو افغانستان میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر امریکا کے خلاف پُرتشدد کارروائیاں چلا رہا ہے۔ **۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو امریکا نے افغانستان کے خلاف جو کارروائی کی وہ انٹرنیشنل نارم کے مطابق درست تھی' کیونکہ وہ ڈیفنس کے طور پر کی گئی۔ اس کے باوجود ایسا ہوا کہ ساری دنیا میں امریکا کو برا کہا جانے لگا' امریکا کے خلاف لوگوں کی نفرت بہت زیادہ بڑھ گئی۔**'' (ماہنامہ الرسالہ' جولائی ۲۰۰۷ء' ص ۳۰۔۳۱)

ایک اور جگہ ہر معاملہ میں مسلمانوں ہی کو موردِ الزام ٹھہرانے کے اپنے عمل کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الرسالہ کا انداز قرآنی ہے' کیونکہ قرآن نے جنگ اُحد میں مسلمانوں کے جانی ومالی نقصان کی ساری ذمہ داری یک طرفہ طور پر انہی پر ڈالی اور مشرکین مکہ کے جارحانہ اقدام پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا۔'' (ماہنامہ الرسالہ' مارچ ۲۰۰۷ء' ص ۴۵-۴۶)

مشرکین پر دیگر بیسیوں مقامات پر قرآن نے جو منفی تبصرے کیے ہیں' وہ خان صاحب کو کیوں نظر نہیں آتے؟ ہم یہی کہیں گے کہ فکر مودودی ؒ کے ردِ عمل میں مسلمانوں کی تحریکی جدّوجہد سے نفرت کے سبب سے خود اہلِ اسلام ہی سے بغض وعداوت کے حوالہ سے ان کے ذہن کی جو کنڈیشننگ ہو چکی ہے' اس کی کنڈیشننگ اب ایک ناممکن امر معلوم ہوتی ہے۔ ایک جگہ خان صاحب لکھتے ہیں:

''یہ ایک عام تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص ردِ عمل کی نفسیات کے تحت سوچے تو ہمیشہ اس کی سوچ انتہا پسندانہ سوچ بن جاتی ہے۔ ایسا انسان کبھی معتدل انداز میں نہیں سوچ سکتا... اس معاملے کی مثالیں مذہب اور غیر مذہب دونوں دائروں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یہ معاملہ اتنا زیادہ عام ہے کہ شاید اس میں کوئی استثناء نہیں۔'' (ماہنامہ الرسالہ' اکتوبر ۲۰۰۹ء' ص ۱۷)

خان صاحب نے بالکل سچ کہا ہے' کہ اس معاملہ میں ان کا بھی استثنا نہیں ہے اور ردِ عمل کی نفسیات میں وہ جہاں پہنچ چکے ہیں' ان کے لیے راہِ اعتدال کی طرف واپس آنے کا کوئی رستہ نظر نہیں آتا۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''قبولِ حق کی ایک رکاوٹ یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے ذہن کا ایک خاص سانچہ بنا لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ سانچہ اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں رہتا۔ اس کے لیے صرف ایسی چیز قابلِ قبول رہ جاتی ہے جو اس کے ذہنی سانچہ کو باقی رکھتے ہوئے اس کے اندر جگہ حاصل کر کے مطمئن ہو جائے۔ کوئی ایسا تصور جو اس کے ذہنی سانچہ کو توڑ کر اپنی جگہ بنانا چاہتا ہو' وہ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا' بلکہ وہ اس پر غور کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۳۴۰)

سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ قطعی طور ثابت ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے اسامہ بن لادن رحمہ اللہ نے کروائے تھے؟ جبکہ امریکہ کے ٹاپ کلاس کے صحافیوں اور تجزیہ نگاروں کی ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ ان حملوں میں اسرائیلی اور امریکی ریاستیں ملوث تھیں اور القاعدہ جیسی جماعت سے ان حملوں کا تصور بھی ایک ناممکن امر ہے۔ تفصیل کے لیے عابد اللہ جان صاحب کی کتاب

The Genesis of the Final Crusade کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ حملے بالفرض اگر اسامہ بن لادن رحمہ اللہ نے کیے بھی تھے اور وہ افغانستان میں روپوش تھے تو عراق پر امریکی حملے کا کیا جواز تھا؟ اگر بفرضِ محال یہ حملے القاعدہ نے بھی کروائے تھے تو افغانستان اور عراق میں ان لاکھوں شہریوں (civilians) کا کیا قصور تھا جو امریکی بمباری کی وجہ سے شہید ہو گئے یا معذور ہو گئے یا زخمی ہوئے؟ خان صاحب اس امریکی ظلم کو خدائی فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''۱۱ نومبر ۲۰۰۱ء میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو توڑنے کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کے بعد امریکا غضب ناک ہو گیا۔ اُس نے عراق اور افغانستان کے خلاف براہ راست طور پر اور پوری دنیا کے خلاف بالواسطہ طور پر ایک انتقامی جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں نام نہاد جہاد کے اکابر رہنما یا تو مارے گئے یا وہ خاموش ہو گئے۔ **امریکا کا یہ آپریشن اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک خدائی آپریشن تھا۔ اس نے ان تمام طاقتوں کو زیر کر دیا جو امن اور دعوت کے مشن کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے۔**'' (ماہنامہ الرسالہ' جولائی ۲۰۱۰ء' ص ۲۶)

سوال یہ ہے کہ جس مسیحی نفسیات یا تعلیمات کی رات دن خان صاحب مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اسے اپنائیں' دشمن سے محبت کریں' یک طرفہ اخلاقیات اختیار کریں' برائی کا جواب اچھائی سے دیں وغیرہ' کیا مسیحی دنیا یورپ اور امریکہ کو ان تعلیمات کی ضرورت نہیں ہے؟ امریکہ اگر اپنی دینی مسیحی تعلیمات کو ترک کرتے ہوئے مسلم دنیا کو راکھ کا ڈھیر بنا دے تو خدائی مشن پورا ہو رہا ہے اور اگر مسلمان اس ظلم کے جواب میں ظالم کو کوئی تھپڑ رسید کر دیں یا ایسا کرنے کی کوئی بات کریں تو وہ ٹررسٹ بن جاتے ہیں۔ کیا عجب نرالی منطق ہے! اور ردِ عمل کی نفسیات میں ذرا مسلمانوں سے اظہارِ نفرت کی انتہا دیکھیں۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''موجودہ زمانے میں ۵۷ مسلم ملک ہیں۔ مگر یہ کہنا غالباً درست ہوگا کہ اس وقت اسلام کی خدمت کے جتنے مواقع امریکا میں ہیں' وہ غالباً کسی مسلم ملک میں بھی نہیں۔''
(ماہنامہ الرسالہ' اکتوبر ۲۰۱۰ء' ص ۹)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''امریکا میں اسلام کے نام پر جتنی سرگرمیاں ہوتی ہیں' اتنی سرگرمیاں غالباً کسی مسلم ملک میں بھی نہیں' وغیرہ۔'' (ماہنامہ الرسالہ' جنوری ۲۰۱۱ء' ص ۳۴)

ایک اور جگہ خان صاحب لکھتے ہیں کہ مسلم دنیا کے خلاف امریکی جنگ اس کے مفادات کی جنگ ہے نہ کہ مسلمان یا اسلام دشمنی کی جنگ۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''امریکا کے عراق پر حملے سے پہلے عام طور پر مسلمانوں میں امریکا کے بارے میں اچھی رائے تھی۔ اس وقت عرب لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے تھے کہ: أمریکا صَدِیق کبیر (امریکا ایک بڑا دوست ہے) لیکن بعد کے زمانے میں جب امریکا کی فوجوں نے عراق اور افغانستان پر حملہ کیا تو اس کے بعد لوگوں کی رائے بدل گئی۔ اب عرب عام طور پر یہ کہنے لگے: أمریکا عدو الاسلام رقم واحد (امریکا اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے)۔ امریکا کے بارے میں یہ منفی رائے دنیا بھر کے تمام مسلمانوں میں پائی جاتی ہے' خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب۔ یہ سوچ موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں... مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ کیوں ایسا ہے کہ امریکا نے عراق پر بم باری کی' لیکن وہی امریکا سعودی عرب کی بھرپور حمایت کرتا ہے۔ امریکا ایک طرف اسرائیل کی مدد کرتا ہے اور دوسری طرف وہی امریکا پاکستان کو غیر معمولی مدد دے رہا ہے۔ جارج بش سینئر کے دور سے پہلے امریکا میں ایک بھی مسجد نہیں تھی اور آج امریکا میں ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں (اسلامک سنٹر) ہیں۔ امریکا میں اسلام کے نام پر جتنی سرگرمیاں ہوتی ہیں' اتنی سرگرمیاں غالباً کسی مسلم ملک میں بھی نہیں' وغیرہ۔ اس تقابل پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ امریکا کا کیس نہ اینٹی اسلام کیس ہے اور نہ پرو مسلم کیس' بلکہ اس کا کیس پرو امریکا کیس ہے' یعنی امریکا جو کچھ کر رہا ہے' وہ اپنے قومی مفاد کے لیے کر رہا ہے' نہ کہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کے لیے۔'' (ماہنامہ الرسالہ' جنوری ۲۰۱۱ء' ص ۳۴)

سوال یہ ہے کہ اگر امریکا نے افغانستان اور عراق پر حملہ اسلام اور مسلمان دشمنی میں نہیں کیا تو صدر بش نے اس امریکی جنگ کو ''کروسیڈ'' کیوں قرار دیا؟ اور کروسیڈز کیا مفادات کی جنگیں تھیں یا مذہبی؟ باقی رہی یہ بات کہ امریکہ پاکستان کی امداد کیوں کر رہا ہے تو اگر کوئی اپنی ڈی کنڈیشننگ کے ارادے سے سمجھنا چاہے تو بات واضح ہے کہ پاکستان افغانستان کے خلاف امریکی جنگ میں اسے لاجسٹک سپورٹ مہیا کر کے ایک ہراول دستے کا کردار ادا کر رہا تھا اور تا حال افغانستان میں بیشتر نیٹو سپلائی پاکستان سے جا رہی ہے۔ سعودی عرب کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس نے عراق کے خلاف امریکی جنگ میں امریکہ کو اپنے ہوائی اڈے اور تیل فراہم کیا' وغیرہ۔

خان صاحب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان کا تصورِ امن وہ تصور ہے جو پچھلے ہزار سال میں پہلی دفعہ ان کی طرف سے پیش ہوا ہے۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''پچھلے ہزار سال میں مسلمانوں کے درمیان جو لٹریچر تیار ہوا' اس میں سب کچھ تھا' مگر اس میں دو چیز مکمل طور پر حذف تھی اور اور وہ ہے دعوت اور امن کا تصور۔ اس کے بعد جب مغربی طاقتوں نے مسلم ایمپائر کو توڑ دیا تو اس کے خلاف ردعمل کی بنا پر یہ ذہن اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی عیسوی پوری کی پوری' منفی سوچ اور منفی سرگرمیوں کی نذر ہو گئی۔ اس پوری صدی میں نہ دعوت کا پیغام لوگوں کے سامنے آیا اور نہ امن کا پیغام' جب کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ راقم الحروف پر اللہ تعالیٰ نے استثنائی طور پر دعوت اور امن کی اہمیت کھولی۔'' (ماہنامہ الرسالہ' جولائی ۲۰۱۰ء' ص ۲۳-۲۴)

خان صاحب جس ''استثنا'' کو اپنے لیے فخر کا باعث سمجھتے ہیں' وہی درحقیقت ان کا سب سے بڑا عیب ہے کہ اُمت مسلمہ کی ہزار سالہ تاریخ میں کسی کو دین کا صحیح تصور سمجھ ہی نہیں آیا اور اگر آیا ہے تو جناب خان صاحب کو آیا ہے۔ خان صاحب فخر کی جس نفسیات میں جی رہے ہیں' اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کے اندر ایک نفسیات مشترک طور موجود رہتی ہے' فخر اور نفرت۔ فخر کا جذبہ اپنے لیے' اور نفرت کا جذبہ دوسروں کے لیے۔ ہر آدمی انہیں دو احساسات کے درمیان جیتا ہے اور انہیں دو احساسات کے درمیان مرجاتا ہے... یہ دونوں جذبے اتنا زیادہ عام ہیں کہ اس کو انسان کا عالمی مزاج کہا جاسکتا ہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ' اکتوبر ۲۰۰۹ء' ص ۲۷)

جہاں تک کتاب وسنت کے تصور امن کی بات ہے تو یہ معتدل تصور خان صاحب کے تصور سے کلیتاً مختلف ہے۔ اس میں دعوت وتبلیغ بھی ہے اور جہاد وقتال بھی۔ جہاد وقتال کی جو علت قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ ظلم ہے' یعنی ظلم کے خاتمے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قتال کو مشروع قرار دیا ہے' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ﴾ (الحج: ۳۹)

''اجازت دی گئی ان لوگوں کو (قتال کی) جن سے لڑائی کی جاتی ہے' اس وجہ سے کہ ان پر ظلم ہوا۔''

اس آیت میں 'باء' تعلیلیہ ہے' یعنی یہ اذنِ قتال کی علت بیان کر رہا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ مفسّرین کی توضیح کے مطابق حکم قتال کی علت کفر یا شرک نہیں ہے' اگرچہ قتال اصلاً مشرکین اور کفار ہی سے ہوتا ہے۔ کفار یا مشرکین سے قتال کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا کہ وہ کافر یا مشرک ہیں یا اسلام کا مقصود دنیا کو کفار و مشرکین سے پاک کرنا ہے' بلکہ کفار اور مشرکین سے قتال کے حکم کی بنیادی وجہ بھی ظلم ہی ہے' کیونکہ جہاں جس قدر شرک اور کفر ہوگا وہاں اتنا ہی ظلم ہوگا۔ اس لیے کفار اور مشرکین سے قتال دراصل ظالمین سے قتال ہے' کیونکہ ظلم اور کفر و شرک تقریباً لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں کئی جگہ شرک کے لیے ظلم اور کفار کے لیے ظالمین کے الفاظ آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ظلم مسلمان بھی کرے تو اس سے بھی قتال ہوگا' جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ (الحجرات:۹)

''اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرواؤ اور اگر (صلح کے بعد) ان میں ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو تم سب اس سے قتال کرو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔''

اسی طرح اگر کافر' ظالم نہ ہو تو اس کے ساتھ قتال نہیں ہوگا بلکہ ایسے کافروں کے ساتھ حسن سلوک بھی جائز ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾ (الممتحنة)

''اللہ تعالیٰ تمہیں ان کافروں سے حسن سلوک یا انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا کہ جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں قتال نہیں کیا اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

لہٰذا جہاد و قتال صرف ان کفار اور مشرکین سے ہے جو کہ ظلم کے مرتکب ہوں۔ اب ظلم کئی طرح کا ہوتا ہے۔ ایک ظلم وہ ہے جس کا تعلق انسان کی اپنی جان سے ہوتا ہے جیسا کسی شخص کا کافر یا مشرک ہونا بھی ایک ظلم ہے۔ لیکن ایسا ظلم جو کہ کسی انسان کے اپنے نفس تک محدود رہے اور

متعدی نہ ہو تو اس ظلم کے خلاف جہاد و قتال نہیں ہے بلکہ اسلام ایسے ظلم کو بزورِ شمشیر ختم کرنے کو نہیں کہتا جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے صریح کفر و شرک کے باوجود اللہ نے انہیں زندہ رہنے کی اجازت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝﴾ (التوبة)

''تم اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے قتال کرو جو کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کو حرام نہیں ٹھہراتے کہ جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہو اور دینِ حق کو بطور دین اختیار نہیں کرتے' یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔''

لیکن ایسا ظلم جو کہ متعدی ہو' یعنی جس کے اثرات صرف انسان کی اپنی ذات تک محدود نہ ہوں بلکہ عامۃ الناس بھی اس کے ظلم سے متاثر ہو رہے ہوں تو ایسے شخص کے خلاف جہاد و قتال ہوگا۔ قرآن و سنت کی نصوص سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک کافر یا مشرک کی حکومت اللہ تعالیٰ کبھی بھی برداشت نہیں کرتے' کیونکہ جہاں بھی کافر یا مشرک کی حکومت ہوگی وہاں ظلم متعدی ہوگا اور عوام الناس اس ظلم سے متاثر ہوں گے' اس لیے اہلِ کتاب کے انفرادی کفر و شرک کو تو برداشت کیا گیا ہے لیکن مذکورہ بالا آیت میں ان کی ذلت و رسوائی اور حکومت کے خاتمے کو قتال کی غایت و انتہا قرار دیا گیا ہے۔ یہاں اس آیت میں اعطائے جزیہ اور اہل کتاب کی ذلت کو قتال کی غایت قرار دیا ہے تو ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فتنے کے خاتمے اور اطاعت کا صرف اللہ ہی کے لیے ہو جانے کو قتال کا منتہائے مقصود بیان کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الأنفال : ۳۹)

''اور ان (مشرکین) سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اطاعت) کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اجتماعی کفر (یعنی کفر کی حکومت) اور اجتماعی شرک (یعنی شرک کی حکومت) کو پسند نہیں کرتے' کیونکہ ایسی حکومت میں ہمیشہ ظلم ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی اور مقامات پر بھی ایسے کفار سے قتال کا حکم دیا ہے جن کا ظلم متعدی ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝﴾ (النساء)

''(اے مسلمانو!) اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے رستے میں قتال نہیں کرتے جبکہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے یہ کہہ رہے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال کہ جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور تو ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک ولی مقرر کر اور ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک مددگار بنا۔''

ایک اور جگہ قرآن میں ایسے کفار سے دوستی اور حسن سلوک کرنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے جنہوں نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ﴾ (الممتحنة : ٩)

''اللہ تعالیٰ تو تم کو بس ان ہی لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے کہ جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے قتال کیا اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے پر (تمہارے دشمنوں) کی مدد کی۔''

اللہ تعالیٰ نے جو احکامات دیے ہیں انہیں فقہائے اسلام نے دو طرح سے تقسیم کیا ہے' ایک حَسَن لذاتہ اور دوسرے حَسَن لغیرہ۔ حسن لذاتہ سے مراد ایسے احکامات ہیں جو کہ فی نفسہ اسلام میں مطلوب ہیں' جبکہ حسن لغیرہ ان احکامات کو کہتے ہیں جو فی نفسہ مطلوب نہ ہوں (وهبة الزحيلي الدكتور' أصول الفقه الإسلامي' دار الفكر' دمشق' الطبعة الأولى' ١٩٨٦ء' ١٣٠/١)۔ اسلام نے لڑائی جھگڑے کو فی نفسہ ناپسند قرار دیا ہے' جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا))

(صحيح البخاري' كتاب الجهاد والسير' باب كان النبي ﷺ إذا لم يقاتل أول النهار أخر' ١٠٨٢/٣)

''دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرتے رہو' لیکن اگر تمہاری دشمن سے مڈبھیڑ ہو جائے تو پھر ڈٹ جاؤ۔''

اسلام نے کچھ مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے قتال کو فرض قرار دیا ہے اور وہ ظلم کا خاتمہ اور عدل وانصاف کا بول بالا ہے' لہٰذا قتال حسن لذاتہ نہیں ہے بلکہ حسن لغیرہ ہے۔ ظلم کے خاتمے کے لیے انسانوں کے قتل کو جائز قرار دیا گیا۔ اور بالفرض جس مقصد کے لیے جہاد وقتال کو جائز کہا گیا ہے اگر وہ مقصود ہی پورا نہ ہو رہا ہو اور جہاد وقتال سے ظلم ختم ہونے کی بجائے بڑھ رہا ہو تو یہ جہاد وقتال جائز نہیں ہے۔

قتال کی غایت یا منتہائے مقصود اُس فتنے' عدم اطاعت' کفر' شرک یا زیادتی کا خاتمہ ہے کہ جس کا نتیجہ ظلم ہو۔ پس جہاد وقتال ہر ایسے فتنے' عدم اطاعت' کفر' شرک یا زیادتی کے ختم ہونے تک جاری رہے گا کہ جس سے دوسروں پر ظلم ہو رہا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ﴾ (البقرة : ١٩٣)

''اور ان (یعنی مشرکین) سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اطاعت) اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الأنفال : ٣٩)

''اور ان (یعنی مشرکین) سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اطاعت) کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔''

اس آیت میں فتنے سے مراد کفار کی طرف سے مسلمانوں پر ہونے والا وہ تشدد اور ظلم ہے جو اہل ایمان کے ایمان کے لیے آزمائش بن جاتا ہے۔ جبکہ 'دین' کا بنیادی معنی اطاعت اور بدلہ ہے' جیسا کہ امام راغب رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہاں پر دین سے مراد اجتماعی اور کلی اطاعت ہے' کیونکہ انفرادی اور جزوی اطاعت میں تو مسلمان بھی بعض اوقات اللہ کی اطاعت نہیں کرتے۔ اس لیے یہاں پر مراد اللہ تعالیٰ کی ایسی اطاعت ہے کہ جس کے عدم کی صورت میں کسی پر ظلم لازم آئے' مثلاً اللہ کے نازل کردہ حدود کے نفاذ میں اس کی اطاعت کا نہ ہونا معاشرے میں ظلم کا سبب ہوگا۔ اس لیے حدود اللہ میں اللہ کی اطاعت تک اُمتِ مسلمہ پر کفار سے جہاد وقتال واجب رہے گا۔

لہٰذا ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ قتال اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ کفار کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم وتشدد کا سلسلہ جاری رہتا ہے یا جب تک کفار ومشرکین کو ہر اس معاملے میں

مطیع وفرمانبردار نہ بنا لیا جائے کہ جس کے نہ ہونے کی صورت میں دوسروں پر ظلم و زیادتی ہو۔ظاہری بات ہے کہ کفار ومشرکین کے اپنے عقیدے پر قائم رہنے یا اس کے مطابق عبادات کرنے سے کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوتی 'لہٰذا ان سے اس معاملے میں اطاعت جبراً نہیں کروائی جائے گی' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾(البقرۃ: ۲۵۶)

''دین [قبول کرنے میں] میں کسی قسم کا کوئی جبر نہیں ہے۔''

لیکن ریاست وحکومت کے انتظامی امور میں کفار ومشرکین کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے اور قتال اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تمام کے تمام کفار ومشرکین اس دُنیاوی نظام میں اللہ کے مطیع وفرمانبردار نہیں بن جاتے' یعنی جب تک اللہ کے دین کا غلبہ تمام ادیان باطلہ پر نہیں ہو جاتا اس وقت تک قتال جاری رہے گا۔اس ضمن میں سورۃ التوبہ کی آیت ۲۹ ایک بار پھر ملاحظہ کر لی جائے' جس کا حوالہ گزشتہ صفحات میں گزر رہا ہے اور اسی بات کو قرآن حکیم میں دو مقامات پر بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝﴾(التوبۃ: ۳۳'الصف:۹)

''وہی (اللہ تعالیٰ) ہے کہ جس نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا قرآن مجید اور دین حق دے کر تاکہ وہ اس کو تمام ادیان [باطلہ] پر غالب کر دے اگرچہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی برا کیوں نہ لگے!''

اور اسی بات کو اللہ کے رسول ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ ' فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَائَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ' وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ)) (صحیح البخاری'کتاب الإیمان' باب فإن تابوا وأقاموا الصلاۃ وآتوا الزکوۃ' ۱/۱۷)

''مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ یہ اقرار نہ کر لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ ادا نہ کریں۔پس جب وہ یہ کر لیں گے' تو اپنے مال اور جانیں مجھ سے بچا لیں گے' سوائے اسلام کے حق کے' اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔''

اس حدیث مبارکہ میں 'الناس' سے مراد مشرکین ہیں' کیونکہ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کی ایک روایت میں ((اَنْ اُقَاتِلَ الْمُشْرِكِيْنَ)) کے الفاظ آئے ہیں۔قرآن حکیم میں سورۃ التوبہ میں بھی یہ حکم ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾(التوبۃ)

''پس تم مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کا گھیراؤ کرو اور ان کے لیے ہر گھات لگانے کی جگہ میں بیٹھو۔پس اگر وہ لوٹ آئیں (یعنی اپنے کفر سے اسلام کی طرف) اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

قرآن کے اسی حکم کو اللہ کے رسول ﷺ نے ((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ)) کے الفاظ سے بیان کیا ہے' جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو اسی آیت کی تفسیر کے طور پر بیان کیا ہے۔چونکہ اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت مشرکین عرب کی طرف خاص طور پر ہوئی تھی اس لیے ان کے معاملے میں یہود ونصاریٰ اور دوسرے کفار کی نسبت زیادہ سختی کی گئی ہے اور ان کے لیے جزیہ کی صورت باقی نہیں رکھی گئی۔پس ان مشرکین کے لیے دو ہی صورتیں تھیں: یا تو اسلام قبول کر لیں یا پھر قتال کے لیے تیار ہو جائیں' یا تیسری implied صورت یہ تھی کہ حجاز کا علاقہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں۔

یہ واضح رہے کہ قتال کی اس علت اور غایت کی بنیاد پر قتال اس وقت ہوگا جبکہ کوئی مسلمان ریاست یا اجتماعیت اُن اسباب و ذرائع اور استعداد وصلاحیت کی حامل ہو کہ جو اس کے لیے از بس ضروری ہیں۔جب تک ہمارے پاس کفار سے جنگ کی استعداد وصلاحیت موجود نہیں ہے اُس وقت تک اسلام کے پھیلانے کا منہج دعوت وتبلیغ ہے نہ کہ جہاد وقتال۔اور کفار کے ظلم کا جواب صبر ہے نہ کہ جنگ وجدال جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے حیاتِ مکی کے منہج سے واضح ہوتا ہے۔کسی بھی معاشرے میں اسلام کے نفوذ کے لیے مسلمانوں کو حالات کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو منہج دیے گئے ہیں:

(۱) دعوت وتبلیغ اور صبر ومصابرت

(۲) جہاد وقتال اور ظلم وستم کا خاتمہ ونظام عدل کا قیام

دونوں مناہج کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف حالات میں کام کیا ہے اور اب بھی جیسے حالات ہوں گے ویسا ہی منہج اختیار کیا جائے گا۔ امام زرکشی رحمہ اللہ نے 'البرھان' میں ناسخ ومنسوخ کی بحث کے تحت اس موضوع پر عمدہ کلام کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسلام کے یہ دونوں مناہج تاحال برقرار ہیں اور حالات کے تحت کسی بھی منہج کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ (الزرکشی أبو عبد الله بدر الدین محمد بن عبد الله بن بهادر' البرهان فی علوم القرآن' دار احیاء الکتب العربیة' الطبعة الاولی' ۱۹۵۷ء' ۲/۴۳۔۴۴)

اگلی قسط میں ہم' ان شاء اللہ' خان صاحب کے تصورِ توہینِ رسالت اور ختمِ نبوت پر روشنی ڈالیں گے۔ (جاری ہے)

شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالرحمٰن اشرفی قدس سرہ

شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اشرفیہ لاہور کے

➥ حالاتِ زندگی ➥ اندرون وبیرون ملک اسفار ➥ علمی واصلاحی شہ پارے

➥ لطیف نکات ➥ ملفوظات ➥ مناظرے اور وظائف ➥ خطبات

➥ اتحادِ بین المسلمین اور نفاذِ شریعت کی کاوشیں ➥ دینی وملّی خدمات مرتب ومدون کیے جا رہے ہیں

آپکے پاس کوئی ایسی تحریری یا زبانی یادداشت موجود ومحفوظ ہو تو ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے چونکہ سوانح عمری اپنے آخری مراحل میں ہے اس لیے آپ اس کو مندرجہ ذیل پتہ پر جلد از جلد ارسال فرمادیں یا ہمیں فون فرمادیں ہمارا نمائندہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ نوادرات وصول یاریکارڈ کر لے گا۔

نگران اعلیٰ ابوالحسین حافظ محمد حسن اشرفی

بن حضرت مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب نوراللہ مرقدہٗ

ادارۃ الحسن: متصل ایجوکیشن بلاک، جامعہ اشرفیہ، فیروز پور روڈ لاہور

فون: 03009475594, 0333-4898866 فیکس: 042-37552986

عیاری اور شعبدہ بازی سے وہ کچھ عرصہ تک عوام کی اکثریت کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہمیں بہرحال پاکستان سے مطلب ہے اور پاکستان کا سرمایہ دار' وڈیرہ اور جاگیردار تو کُند چھری سے اپنی مرغی کو ذبح کرنے پر تلا ہوا ہے۔

لہٰذا ہمارا سوال یہاں کی سیاسی وغیر سیاسی مذہبی جماعتوں اور مخلص افراد سے یہ ہے کہ کیا یہ سارا تماشا دیکھ کر اور گاؤ اور خر کی آمد ورفت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر کے بھی وہ کسی حقیقی تبدیلی کی امید لگائے ہوئے ہیں؟ کیا اب بھی سوچ یہی ہے کہ democratic process یعنی جمہوری لائحہ عمل اختیار کرنے سے پاکستان میں انقلاب آ جائے گا؟ کیا اب بھی آنکھیں نہیں کھلیں؟ کیا کسی بڑے حادثے اور سانحہ کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ یہ حقیقت آشکار ہو کہ تبدیلی کے لیے انقلاب ناگزیر ہے؟ جمہوری لائحہ عمل سے تو کوئی راجہ' کوئی مخدوم' کوئی شریف' کوئی چودھری سٹیٹس کے دوام کے لیے آئے گا۔ نعروں میں تو اختلاف ہوگا مگر عزائم اور ہدف یقیناً ایک جیسے ہوں گے۔ ہم کتنا عرصہ خود فریبی میں مبتلا رہیں گے؟ کب تک حقیقت سے آنکھیں چرائیں گے؟ کسی زمانے میں ہم نے سافٹ انقلاب کے لیے اپنے دل اور دماغ میں زبردستی جگہ پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ ہم بہت زیادہ rigidity کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں اسلام کے نفاذ سے غرض ہے' اپنے منہج ہی کو درست ثابت کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر کسی دوسرے ذریعے سے (یعنی سافٹ انقلاب وغیرہ سے) حقیقی اسلام کا نفاذ ہو جائے تو ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم آم کھانے سے غرض رکھتے ہیں' پیڑ گننے سے نہیں۔ لیکن جو صورتِ حال اب سامنے آ رہی ہے اور حالات کا رخ جو سمت اختیار کر رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام صرف منہجِ انقلابِ نبویؐ کی پیروی میں ہی ممکن ہے' اور یہ اب کوئی کہنے والی بات نہیں رہ گئی' بلکہ نوشتۂ دیوار ہے اور اندھوں پر بھی واضح ہو رہا ہے کہ پاکستان کا مستقبل صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے' پاکستان کا آج بھی مطلب ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے۔ وگرنہ پاکستان بے مطلب اور بے مقصد ہو جاتا ہے اور قدرت کے کارخانے میں بے مقصد چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 400 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 250 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042
maktaba@tanzeem.org

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع!

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' مزید برآں 44 آڈیو کیسٹس کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I,II,III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز
قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون 3-35869501

- ہمارا دین "دینِ توحید" ہے اور "توحید" کی ضِد "شِرک" ہے۔
- شِرک سب سے بڑا گناہ ہے اور ناقابلِ درگزر ہے۔
- قرآن کی رو سے شرک "ظلمِ عظیم" ہے۔
- شِرک ہر دور میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔
- مسلمان جہالت اور ناسمجھی کے سبب شِرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شِرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت' اور دورِ حاضر کے شِرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

حقیقت و اَقسامِ شرک

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے چھ فکر انگیز خطابات

معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ❁ عمدہ طباعت ❁ 128 صفحات

قیمت: اشاعت عام: 60 روپے' اشاعت خاص: 90 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور**

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org